الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدّین خاں

دوسروں سے نہ لڑنے کے لئے
اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے

اکتوبر ۱۹۸۴ء
شمارہ ۹۵

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان
اُردو، انگریزی میں شائع ہوتا ہے

اکتوبر ۱۹۸۴ء □ شمارہ ۹۵

زرِ تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی 'AL-RISALA MONTHLY' لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون نمبر ۶۱۱۱۲۸

فہرست

کن فیکون	۳
کیسا عجیب	۴
غلط فہمی	۵
عقیدۂ خدا	۶
تحقیق کیجئے	۷
توحید اور شرک	۸
فیصلہ خداوندی	۹
عقلمند کون	۱۰
دو سو سال	۱۱
رواجی ذہن	۱۲
دشمنی کے وقت بھی	۱۳
کینہ پن	۱۴
موقع نہ کھوئیے	۱۵
نظریۂ ارتقار	۱۸
کردار کا معاملہ	۱۹
فہم قرآن	۲۱
علم اور تقویٰ	۲۲
صرف الفاظ	۲۳
فطرت کا اعتراف	۲۴
نفاذ شریعت	۲۶
حق کی دعوت	۲۸
قومی عظمت	۲۹
آرزوؤں کی دنیا	۳۱
محبت کا نذرانہ	۳۲
غلط ذہن	۳۳
ایک سفر	۳۴
خبر نامہ	۴۷

خدا کا وجود

خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت انسان کا خود اپنا وجود ہے۔ خدا جیسی ہستی کو ماننا جتنا مستبعد ہے اتنا ہی مستبعد یہ بھی ہے کہ انسان جیسی ہستی کو مانا جائے۔ اگر ہم ایک انسان کو مانتے ہیں تو ایک خدا کو ماننے میں بھی ہمارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی (الحجر ۲۹) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی صفات کا ایک بشری نمونہ ہے۔ وجود، زندگی، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری صفات کمال جن کا حقیقی مظہر صرف خدا کی ذات ہے۔ ان کا ایک عکس (نہ کہ حصہ) انسان کو ودیعت کیا گیا ہے۔ انسان کسی بھی اعتبار سے خدا کا جزء نہیں مگر وہ اپنی ذات میں اس خدا کی محسوس دلیل ہے جس کو غیبی طور پر ماننے کا اس سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کے اندر وہ ساری خصوصیات شہود کے درجہ میں موجود ہیں جن خصوصیات کے ساتھ ایک خدا کو غیب کے درجہ میں ماننے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ دیکھنے اور سننے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور منصوبہ بناتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی ارادہ کے تحت حرکت کرتا ہے۔ وہ مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعہ خلائی مشین کو چلاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا شعور رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ "میں ہوں" —— انھیں صفات کی کامل ہستی کا نام خدا ہے۔

انسان اور خدا میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا وجود غیر حقیقی ہے اور خدا کا وجود حقیقی۔ یہ مخلوق ہے اور وہ خالق۔ یہ محدود ہے اور وہ لامحدود۔ یہ بے اختیار ہے اور وہ بااختیار۔ یہ فانی ہے اور وہ غیر فانی۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ عطیہ ہے جب کہ خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا ذاتی ہے، وہ کسی دوسرے کا دیا ہوا نہیں۔

انسان کو ماننا بلاتشبیہہ "چھوٹے خدا" کو ماننا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے وہ "بڑے خدا" کو نہ مانے۔ ہر شخص جو خدا کو نہیں مانتا وہ یقیناً اپنا اقرار کرتا ہے۔ وہ انسانی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ جو شخص انسان کو مان رہا ہو اس کے لئے خدا کو نہ ماننے کی کوئی دلیل نہیں۔ انسان کے وجود کا اقرار کر کے وہ خدا کے وجود کا بھی اقرار کر چکا ہے، خواہ وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا انکار خود اپنا انکار ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنا انکار کر سکے۔

کن فیکون

آجکل جو موٹر کاریں سڑکوں پہ دوڑتی ہیں وہ زیادہ تر اسی مشینی اصول پر بنائی گئی ہیں جو نکولاس آٹو (Nikolaus Otto) نے ۱۸۷۶ میں وضع کیا تھا۔ تاہم پچھلے برسوں میں کار کی دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا ہے۔ اب ایسی کاریں بن رہی ہیں جن کے انجن کے ساتھ ایک کمپیوٹر لگا ہوتا ہے اور وہ بہت سے کام خود بخود انجام دیتا ہے۔

مثلاً وہ بتاتا ہے کہ ـــــ سیٹ بلٹ باندھ لیجئے، ایک دروازہ ٹھیک سے بند نہیں ہے، آپ کی ٹنکی میں ایندھن کم ہے وغیرہ۔

انھیں نئی چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ ڈرائیور اپنی کار کو زبانی ہدایات دے سکتا ہے۔ وہ ہاتھ سے کوئی پرزہ چھوئے بغیر زبان سے الفاظ بول کر اس کو کوئی حکم دے سکتا ہے۔ امریکی جرنل اسپین (Span) کی مئی ۱۹۸۴ کی اشاعت میں اس سلسلہ میں ایک رپورٹ شائع کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ درج کئے گئے ہیں :

---- and you can talk to the cars. The Ford Motor Company has developed a system in which voice commands turn on car lights, raise the antenna, start the windshield wipers, or activate other electrical systems.

اور آپ اپنی کار سے بات کرسکتے ہیں۔ فورڈ موٹر کمپنی نے ایک سسٹم تیار کیا ہے جس کے ذریعہ زبانی حکم سے کار کی لائٹ جل جاتی ہے، انٹینا اٹھ جاتا ہے، وائپرس چلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے برقیاتی نظام متحرک ہو جاتے ہیں۔

یعنی ڈرائیور کو لائٹ جلانی ہے تو وہ اس کا بٹن نہیں دبائے گا بلکہ کہے گا " لائٹ جل جا" اور لائٹ جل جائے گی۔ ڈرائیور کو وائپر چلانا ہے تو وہ اس کے لئے کسی بٹن پر اپنا ہاتھ نہیں لے جائے گا بلکہ کہے گا " وائپر چل جا" اور اس کے فوراً بعد وائپر چلنے لگے گا۔

اس مشینی واقعہ سے قرآن کی آیت کن فیکون (البقرہ ۱۱۷) آج کے انسان کے لئے قابل فہم ہوگئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح منھ سے نکلی ہوئی آواز بھی کسی چیز کو وجود میں لاتی ہے اور ایک پورے نظام کو متحرک کر دیتی ہے۔ خدا کے کن فیکون کی اصل حقیقت کو انسان نہیں جان سکتا۔ تاہم موجودہ زمانہ کے مشینی واقعات نے اس کو نہ سمجھنے والوں کے لئے سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

کیسا عجیب

میں شہر کی ایک پر رونق سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ تیز رفتار سواریاں مسلسل میرے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ وہ انسانوں کو لئے ہوئے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی منزل کی طرف رواں ہوں۔ جیسے وہ کسی پہنچنے کی جگہ پر پہنچنا چاہتی ہوں۔

یہ دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ سواریاں نہیں ہیں بلکہ خدا کے فرشتے ہیں جو انسانوں کو لئے ہوئے تیزی سے بھاگ رہے ہیں تاکہ جلد از جلد تمام انسانوں کو اس کے خالق و مالک کے دربار میں پہنچا دیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ حالاں کہ وہ خدا کی منزل کی طرف لے جائے جا رہے ہیں نہ کہ اپنی کسی منزل کی طرف۔

زندگی کیا ہے، موجودہ دنیا میں امتحان کی مہلت۔ موت کیا ہے، آخرت کی دنیا میں بجبر داخلہ۔ موجودہ دنیا میں ہم ٹھیک ویسے ہی ہیں جیسے طالب علم امتحان ہال میں ہوتا ہے۔ کوئی طالب علم صرف گھنٹہ بجنے تک امتحان ہال میں رہ سکتا ہے۔ گھنٹہ بجتے ہی وہ اس میں قیام کا حق کھو دیتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں انسان صرف اس وقت تک ہے جب تک موت یا قیامت کا گھنٹہ نہ بجے۔ گھنٹہ بجنے کے بعد نہ دنیا اس کی رہ جاتی ہے اور نہ وہ دنیا کا۔

انسان سمجھتا ہے کہ میں اپنی دنیا میں ہوں۔ حالاں کہ وہ صرف خدا کی دنیا میں ہے۔ انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دئے سے ملا ہے۔ وہ عین اسی لمحہ چھن جائے گا جب کہ خدا ان کو چھیننے کا فیصلہ کرے۔ اس کے بعد انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہ ہوگا جن کو آج وہ اپنا سمجھ رہا ہے۔

انسان پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ بھوکا ہوگا مگر اس کے پاس کھانے کو نہ ہوگا جس سے وہ اپنی بھوک مٹائے۔ وہ پیاسا ہوگا مگر اس کے پاس پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کرے۔ اس پر سخت سردی کا موسم آئے گا مگر اس کے پاس گرم کپڑے نہ ہوں گے جن سے وہ اپنے بدن کو گرم کرے۔ اس کو سخت گرمی کا سامنا ہوگا مگر اس کو کوئی سایہ نہ ملے گا جس کے نیچے جا کر وہ ٹھنڈک حاصل کرے۔

آہ، کیسا عجیب دن انسان پر آنے والا ہے مگر وہ اس سے کتنا زیادہ غافل بنا ہوا ہے۔

غلط فہمی

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے جب فرعون مصر کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے کہا کہ تم دونوں چاہتے ہو کہ زمین میں بڑائی تمھارے لئے ہو (یونس ۷۸)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی دعوتی تقریر میں تو صرف خدا کی بڑائی بیان کی تھی پھر فرعون نے اس کو اس معنی میں کیوں لے لیا کہ موسیٰ اور اس کے بھائی خود اپنی بڑائی چاہتے ہیں۔ اس نے خدا کی بڑائی کی بات کو خود متکلم کی بڑائی کے ہم معنی کیوں سمجھ لیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون خدا کی بڑائی سے واقف نہ تھا۔ وہ صرف انسان کی بڑائی کو جانتا تھا۔ اس کو بس اتنی ہی خبر تھی کہ انسان بڑے ہوا کرتے ہیں۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ خدا سب سے بڑا ہے۔

ایسے لوگوں کی طرف سے دعوت حق کا ردعمل ہمیشہ اسی شکل میں ہوتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے داعی جب خدا کی بڑائی بیان کرتا ہے تو وہ اس کو اس کے سوا کسی اور معنی میں نہیں لے پاتے کہ داعی خود اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے۔

وہ بے آمیز سچائی کو نہیں جانتے۔ وہ صرف اس سچائی سے آشنا ہوتے ہیں جس کے اوپر ان کی محبوب شخصیتوں کی مہر لگی ہوئی ہو۔ اس لئے داعی جب ان کے سامنے بے آمیز سچائی بیان کرتا ہے جس کے اوپر خدا کی مہر لگی ہوئی ہو تو اس کو وہ پہچان نہیں پاتے۔ اس کو وہ داعی کے اپنے احساس برتری پر محمول کر کے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

وہ برتر صداقت سے آشنا نہیں ہوتے۔ وہ صرف اس صداقت کو جانتے ہیں جو ان کے قومی تقاضوں کے ساتھ لپٹی ہوئی ہو۔ اس لئے داعی جب برتر صداقت کا اعلان کرتا ہے تو اس کو سن کر وہ متوحش ہو جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی صداقت ہو سکتی ہے جو ان کے قومی عزائم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہو۔

ایسے لوگ اپنی بے خبری کا الزام داعی کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ کبر میں مبتلا ہے۔ وہ اپنا نام بلند کرنا چاہتا ہے۔ داعی خدا کی بڑائی کا اعلان کرتا ہے اور بے خبر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ داعی خود اپنی بڑائی کا اعلان کر رہا ہے۔ داعی خدا کی ذات کمال کی حمد بیان کرتا ہے مگر بے خبر لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی خودستائی میں مشغول ہے۔ داعی حق کی یکتائی پر زور دیتا ہے اور بے بصیرت لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنی انانیت کا اظہار کر رہا ہے۔

عقیدۂ خدا

شیر کو دیکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس کو مردہ عجائب خانہ میں دیکھیں۔ اور دوسرا شیر وہ ہے جو کھلے جنگل میں نظر آتا ہے۔ مردہ عجائب خانہ میں شیر کی کھال کے اندر بھس وغیرہ بھر کر اس کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ بظاہر وہ شیر کی مانند ہوتا ہے۔ مگر وہ صرف شیر کی صورت ہوتی ہے، نہ کہ فی الواقع شیر۔ ایسے شیر کو لوگ صرف تفریح کے طور پر دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اس سے ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

مگر جنگل کا شیر ایک زندہ شیر ہے۔ وہ ناقابل تسخیر قوت کا نشان ہے۔ وہ جب چلتا ہے تو سارا جنگل سہم اٹھتا ہے۔ وہ جب دھاڑتا ہے تو جانور دہشت زدہ ہو کر گر پڑتے ہیں۔ کوئی آدمی اگر جنگل میں زندہ شیر کو دیکھ لے تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے تمام ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں۔ وہ ویسا نہیں رہتا جیسا وہ اس کو دیکھنے سے پہلے تھا۔

اس مثال سے خدا کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خدا پر عقیدہ کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے خدا پر تقلیدی عقیدہ۔ دوسرا ہے خدا پر زندہ عقیدہ۔

خدا پر تقلیدی عقیدہ ایک بے جان عقیدہ ہے۔ ایسا عقیدہ آدمی کی روح کو نہیں تڑپاتا۔ وہ اس کی رگوں میں بجلی بن کر نہیں دوڑتا۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ خدا کے تقلیدی عقیدہ میں خدا کو ماننا ہوتا ہے مگر خدا سے ڈرنا نہیں ہوتا۔

مگر خدا پر زندہ عقیدہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا پر زندہ عقیدہ خدا کو اس کی اتھاہ قوتوں کے ساتھ اس کو دیکھ لینے کا نام ہے۔ جو شخص اس طرح خدا کو پالے وہ پانے کے بعد ویسا نہیں رہ سکتا جیسا کہ وہ پانے سے پہلے تھا۔ خدا کو پانے کے بعد اس کے سارے وجود کے اندر بھونچال آجاتا ہے۔ خوف کی شدّت سے اس کی روح سہم اٹھتی ہے۔ اس کے ذہن سے تمام دوسرے مسائل حذف ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف ایک ہی مسئلہ کو جانتا ہے اور وہ خدا کا مسئلہ ہے۔

خدا کا زندہ عقیدہ اور خدا کا خوف دونوں ناقابل تقسیم ہیں۔ آپ خدا کے زندہ عقیدہ سے خدا کے خوف کو الگ نہیں کر سکتے۔ جہاں یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوں وہاں سمجھ لیجئے کہ خدا کا زندہ عقیدہ نہیں بلکہ صرف تقلیدی عقیدہ ہے اور تقلیدی عقیدہ کی کوئی قیمت نہیں۔

تحقیق کیجئے

ایک ہندستانی حجاز گیا۔ ایک روز مدینہ میں اس کی ملاقات ایک عرب سے ہوئی۔ بظاہر وہ ایک بدو دکھائی دیتا تھا اور اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ وہاں چونکہ چور کے ہاتھ کاٹ دئے جاتے ہیں، ہندستانی نے خیال کیا کہ یہ کوئی چور ہے۔ اس نے چوری کی تھی جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ ہندستانی کو اولاً اس سے ملنے میں کچھ کراہت محسوس ہوئی۔ پھر جبر کرکے اس کی طرف بڑھا اور اپنے عرب بھائی سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔

گفتگو چلی تو اس نے بتایا کہ وہ مدینہ کے قریب ایک بستی "یُتمہ" کا رہنے والا ہے۔ اس کے پاس کافی زمینیں ہیں جہاں ۲۳ مکائن (ٹیوب ویل) لگے ہوئے ہیں۔ اس کے کھیتوں کی پیداوار بہت بڑی مقدار میں روزانہ مدینہ کے بازار میں آتی ہے۔

پھر اس کے ہاتھ کٹنے کا ذکر ہوا تو اس نے بتایا کہ ۱۹۴۸ میں فلسطین کے معاملہ میں عربوں اور یہودیوں میں جو لڑائی ہوئی وہ اس میں شریک تھا۔ اس کے بازو میں چھ گولیاں لگیں۔ اس کے بعد وہ عرصہ تک اسپتال میں رہا۔ وہاں ڈاکٹروں نے ناگزیر سمجھ کر اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا تاکہ پورے بازو کو متاثر ہونے سے بچایا جاسکے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناقص معلومات کی وجہ سے کس طرح ایک بات کسی کے ذہن میں کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ مذکورہ عرب کو ایک ہندستانی نے ناواقفیت کی بنا پر چور سمجھ لیا حالانکہ وہ ایک مجاہد اور ایک تاجر آدمی تھا۔ وہ دوسروں کو دینے والا تھا نہ کہ ان سے لینے والا وہ سماج کا ایک کارآمد فرد تھا نہ کہ سماج کا رہزن۔

ہر آدمی کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے بارہ میں رائے قائم کرنے میں کبھی جلدی نہ کرے۔ جب بھی اس کے سامنے کوئی بات آئے تو وہ اس کی پوری تحقیق کرے۔ تحقیق سے پہلے ہرگز اس کے بارہ میں اپنی زبان نہ کھولے۔

اگر کسی شخص کے پاس تحقیق کرنے کا وقت یا سامان نہیں ہے تو اس کے لئے دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ مذکورہ معاملہ میں چپ رہے۔ نہ یہ کہ ناقص معلومات کے تحت اس کے بارہ میں بولنے لگے۔ اس دنیا میں چپ رہنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا بولنا۔

توحید اور شرک

آدمی کو موجودہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ایک سہارا درکار ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی بڑائی میں جیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو خدا کی بڑائی میں جئے اور غیر مومن وہ ہے جو خدا کے سوا دوسری بڑائیوں میں جیتا ہو۔

قدیم زمانہ کا مشرک انسان چاند اور سورج کی بڑائی میں جیتا تھا۔ موجودہ زمانہ کا مادہ پرست انسان مادی قوتوں کی بڑائی میں جی رہا ہے۔ کچھ لوگ دولت کو بڑا بنا کر اس کو اپنی تلاش کا جواب بنائے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ انسانی اکابر کی بڑائی میں گم رہتے ہیں اور اس طرح اپنے اس فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔

یہ تمام کی تمام شرک کی صورتیں ہیں۔ یہ ایک حقیقی تلاش کا مصنوعی جواب ہے۔ مومن وہ ہے جو فطرت کی تلاش کے سچے جواب کو پالے۔ جو ظاہری چیزوں میں نہ اٹکے۔ بلکہ ظاہری اور نمائشی چیزوں سے گزر کر آخری حقیقت تک پہنچ جائے۔

مومن انسان جب ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کی ظاہری چمک سے فریب نہیں کھاتا۔ یہ تمام چیزیں اس کو صرف مخلوق نظر آتی ہیں۔ وہ اس کو اسی مقام عجز پر دکھائی دیتی ہیں جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔ مومن ان چیزوں میں سے کسی چیز پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ مخلوقات سے گزر کر خالق کو پالیتا ہے۔

مومن وہ ہے جو اپنی تمام چیزوں کو خدا کا عطیہ سمجھے۔ جو اپنے عجز کی تلافی خدا سے کرے۔ جس کو زمین کے حسن میں خدا کا حسن دکھائی دے۔ جس کو کائنات کی عظمت میں خدا کی عظمت نظر آئے۔ جو تمام بڑائیوں کو خدا کی بڑائی کا عکس سمجھتا ہو۔ جو خدا کے جلووں میں اس طرح گم ہو جائے کہ اس کی حمد خوانی اس کا لذیذ ترین مشغلہ بن جائے۔

ایمان کا مطلب در اصل حاضر میں غائب کو دیکھنا ہے۔ جو کچھ سامنے ہے اس میں اس چھپی ہوئی چیز کو دیکھ لینا ہے جو سامنے نہیں ہے۔ جس کو یہ نظر حاصل ہو جائے اس کو اپنے چاروں طرف صرف خدا کی بڑائی دکھائی دیتی ہے۔ وہ صرف خدا کو اپنا سب کچھ بنا لیتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ اپنی بڑائی نظر آتی اور نہ دوسروں کی بڑائی۔

فیصلہ خداوندی

مفسرین قرآن کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ ایک مجلس تھی جس میں یہودی تھے، عیسائی بھی اور مسلمان بھی۔ ان میں سے ہر گروہ کا یہ خیال تھا کہ وہ دوسروں سے پہلے جنت میں داخل ہوگا۔ یہود نے کہا کہ ہم موسیٰ کے پیرو ہیں جن کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لئے چنا اور ان سے کلام کیا۔ عیسائیوں نے کہا کہ ہم عیسیٰ کے پیرو ہیں جو اللہ کی روح اور اس کی حکمت تھے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم محمد خاتم الرسل کی امت ہیں اور ہم خیر امت ہیں جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے۔ قرآن نے اس کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے صاف طور پر کہا کہ ــــــ نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو شخص بھی برا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حمایتی اور مددگار نہ پائے گا۔ اور جو کوئی بھی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء ۲۴-۱۲۳) ایک اثر میں ہے کہ ایمان نہ خوش خیالیوں کا نام ہے اور نہ ظاہری نمائشوں کا۔ بلکہ اس چیز کا نام ہے جو دل میں ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔

كما ورد في الاثر (ليس الايمان بالتمني ولا بالتحلي ولكن ما وقر في القلب وصدقه العمل) .

روى جماعة من المفسرين للقرآن الكريم ان مجلسا ضم بعضا من اليهود والنصارى والمسلمين ، فزعمت كل طائفة منهم انهم اولى الناس بدخول الجنة ـ اليهود قالوا نحن اتباع موسى الذي اصطفاه الله برسالاته وبكلامه ، والنصارى قالوا نحن اتباع عيسى روح الله وحكمته ـ والمسلمون قالوا نحن اتباع محمد خاتم النبيين وخير امة اخرجت للناس ، فحسم القرآن ذلك وخاطب المسلمين في صراحة ووضوح بقول الله تعالى : **ليس بامانيكم ولا اماني اهل الكتاب من يعمل سوءا يجز به ولا يجد له من دون الله وليا ولا نصيرا . ومن يعمل من الصالحات من ذكر وانثى وهو مؤمن فاولئك يدخلون الجنة ولا يظلمون نقيرا ، النساء ١٢٣ و١٢٤**

ہر مذہب کے لوگوں میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو دوسرے تمام مذاہب سے افضل ثابت کرتے ہیں اور پھر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ان کا مذہب چوں کہ سب سے افضل مذہب ہے اس لئے ان کو خدا کے یہاں سب سے افضل مقام حاصل ہوگا۔

اس قسم کا عقیدہ سراسر بے بنیاد عقیدہ ہے۔ مذاہب کے درمیان جو تقسیم ہے وہ صرف محفوظ اور غیر محفوظ کی ہے نہ کہ افضل اور غیر افضل کی۔ خدا کے یہاں ہر آدمی اپنے ذاتی عمل کے اعتبار سے جانچا جائے گا اور جو شخص اپنے عمل کے اعتبار سے جس درجہ کا ہوگا وہی درجہ اس کو ملے گا۔ درجہ بندی کا کوئی دوسرا معیار خدا کے یہاں نہیں۔

عقلمند کون

انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے بہترین بناوٹ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر بڑھاپا آتا ہے اور اس کی بہترین بناوٹ کو کھا جاتا ہے۔ انسان کو اعلےٰ ترین لذتوں کا احساس دیا گیا ہے۔ مگر ہزار کوشش کے بعد جب وہ ان لذتوں کو پالیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پیدائشی محدودیتوں (Limitations) کی وجہ سے وہ ان لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ انسان کو ایک ایسی زمین دی گئی ہے جو اپنی حسین فضاؤں اور قیمتی ساز وسامان کے ساتھ ساری کائنات میں ایک انتہائی نادر استثنار ہے مگر آدمی اس دنیا کو استعمال نہیں کرپاتا کہ موت آتی ہے اور اس کو اس کی پسند کی دنیا سے جدا کر دیتی ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا ہماری اصل دنیا نہیں۔ اصل دنیا وہ ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے۔ موجودہ دنیا اس آئندہ آنے والی دنیا کا ابتدائی تعارف ہے۔ یہ لذتوں کے اصل خزانہ کا لمحاتی تجربہ ہے۔ یہ ابدی بہشت کا صرف ایک وقتی مظاہرہ ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ آدمی حال کے آئینہ میں مستقبل کے عظیم امکانات کو دیکھے۔ وہ ناقص فلاح میں کامل فلاح کا راز پالے۔

عقلمند انسان وہ ہے جس کو دنیا کا یہ وقتی تجربہ اس کو ابدی دنیا کی یاد دلائے۔ وہ اپنے آپ کو زندگی کے آنے والے دور کے لئے تیار کرے۔ وہ اپنی عمر کے موجودہ مرحلہ کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ اس کے لئے عمر کے اگلے مرحلہ میں کامیابی کا زینہ بن جائے۔

اس کے برعکس نادان وہ ہے جو وقتی اور فانی لذتوں میں گم ہوجائے۔ جو "آج" میں مشغول ہوکر "کل" کو بھول جائے۔ ایسا آدمی اس نادان مسافر کی طرح ہے جو ریلوے اسٹیشن کی بنچ خالی پاکر اس پر سوجائے۔ وہ اسی طرح بے خبر پڑا رہے۔ یہاں تک کہ اس کی ٹرین اپنے وقت پر آئے اور اس کو لئے بغیر آگے چلی جائے۔

موجودہ دنیا آخرت کے سفر کا راستہ ہے۔ جس طرح ایک عام مسافر اس وقت اپنی منزل پر نہیں پہنچتا جب کہ وہ راستہ کی چیزوں میں کھو گیا ہو۔ اسی طرح جو شخص دنیا کی دلفریبیوں میں گم ہوجائے وہ کبھی آخرت کے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ دنیا میں بھٹک کر رہ جائے گا اور بالآخر اس کے حصہ میں حسرت کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا۔

دوسوسال

۱۷۸۲ میں ایک انگریز اڈنبرا سے گلیسگو آیا۔ اس کے پاس دوسو پونڈ تھے اور ایک لکڑی کا پریس۔ اس نے اس کے ذریعہ ایک اخبار جاری کیا۔ ابتداءً اس کا نام تھا گلیسگو ایڈورٹائزر (Glasgow Advertiser) یہی وہ اخبار ہے جو اب (Glasgow Herald) کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کی موجودہ اشاعت روزانہ چار لاکھ ہے۔ اس کے اجراء پر اب دو صد یاں گزر چکی ہیں۔

اس کا بانی جان مننز (John Mennons) ہر قسم کے ناموافق حالات سے دوچار تھا۔ البتہ ایک مبصر کے الفاظ میں ایک چیز اس کے پاس افراط کے ساتھ موجود تھی۔ وہ تھا اس کا اتھاہ جوش (Limitless enthusiasm) اتھاہ جوش اس کے لئے ہر کمی کا بدل بن گیا۔ اس نے ایک ایسے اخبار کی بنیاد رکھی جو دوسو سال سے مسلسل جاری ہے۔ درمیان میں شرکاء کے درمیان زبردست اختلافات بھی پیدا ہوئے مگر وہ حکمت اور صبر کے ساتھ طے کر لئے گئے۔

جو اخبار دوسو سال پہلے لکڑی کے پریس میں ہاتھ کے عمل سے چھاپا گیا تھا وہ آج تمام کا تمام آٹومیٹک مشینوں کے ذریعہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں حروف کمپوز نہیں کئے جاتے اور نہ ڈھالے جاتے۔ بلکہ وہ لیزر شعاعوں کے ذریعہ پلیٹ پر منعکس ہوتے ہیں۔ کاغذ اپنے آپ چھپ کر نکلتا ہے۔ وہ اپنے آپ مڑتا ہے۔ اس کے بعد اس کے بنڈل بنتے ہیں اور بنڈل کے اوپر پولی تھین لپیٹا جاتا ہے۔ اور پھر ڈیسپیچ ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ سب کمپیوٹر کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ جنوری ۱۹۸۴)

مذکورہ انگریزی اخبار چوں کہ برابر دوسو سال سے جاری ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہوا کہ اس دوران میں ہونے والی تمام طباعتی اور اشاعتی ترقیاں اس کی تاریخ کا جزء بن جائیں۔ وہ اس کی ترقی کے لئے زینہ بنتی چلی جائیں۔ اگر بالفرض وہ ابتدائی ۲۵ سال یا ۵۰ سال میں بند ہو گیا ہوتا تو دنیا میں ہر قسم کی ترقیاں ہوتیں مگر مذکورہ اخبار ان ترقیوں میں حصہ دار بننے کے لئے موجود نہ ہوتا۔

موجودہ دنیا میں کوئی کام " دو دن " میں انجام نہیں پاتا۔ اس کو کرنے کے لئے " دوسو سال " درکار ہوتے ہیں۔ مگر دوسوسالہ منصوبہ کی تکمیل کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ جوشِ عمل اور استقلال۔ ان دو چیزوں کے بغیر یہاں کوئی بڑی ترقی ممکن نہیں۔

رواجی ذہن

الیس ہووے (Elias Howe) امریکہ کے مشہور شہر مساچوسٹ کا ایک معمولی کاریگر تھا۔ وہ ۱۸۱۹ میں پیدا ہوا اور صرف ۴۸ سال کی عمر میں ۱۸۶۷ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ مگر اس نے دنیا کو ایک ایسی چیز دی جس نے کپڑے کی تیاری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ سلائی کی مشین تھی جو اس نے ۱۸۴۵ میں ایجاد کی۔

الیس ہووے نے جو مشین بنائی اس کی سوئی میں دھاگا ڈالنے کے لئے ابتداءً سوئی کی جڑ کی طرف چھید ہوتا تھا جیسا کہ عام طور پر ہاتھ کی سوئیوں میں ہوتا ہے۔ ہزاروں برس سے انسان سوئی کی جڑ میں چھید کرتا آرہا تھا۔ اس لئے الیس ہووے نے جب سلائی کی مشین تیار کی تو اس میں بھی عام رواج کے مطابق اس نے جڑ کی طرف چھید بنایا۔ اس کی وجہ سے اس کی مشین ٹھیک کام نہیں کرتی تھی۔ شروع میں وہ اپنی مشین سے صرف جوتا سی سکتا تھا۔ کپڑے کی سلائی اس مشین پر ممکن نہ تھی۔

الیس ہووے ایک عرصہ تک اسی ادھیڑ بن میں رہا مگر اس کی سمجھ میں اس کا کوئی حل نہیں آتا تھا۔ آخر کار اس نے ایک خواب دیکھا۔ اس خواب نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ کسی وحشی قبیلہ کے آدمیوں نے اس کو پکڑ لیا ہے اور اس کو حکم دیا ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹہ کے اندر سلائی کی مشین بنا کر تیار کرے۔ ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے کوشش کی مگر مقررہ مدت میں وہ مشین تیار نہ کر سکا۔ جب وقت پورا ہوگیا تو قبیلہ کے لوگ اس کو مارنے کے لئے دوڑ پڑے۔ ان کے ہاتھ میں برچھا تھا۔ ہووے نے غور سے دیکھا تو ہر برچھے کی نوک پر ایک سوراخ تھا۔ یہی دیکھتے ہوئے اس کی نیند کھل گئی۔

ہووے کو آغاز مل گیا۔ اس نے برچھے کی طرح اپنی سوئی میں بھی نوک کی طرف چھید بنایا اور اس میں دھاگا ڈالا۔ اب مسئلہ حل تھا۔ دھاگے کا چھید اوپر ہونے کی وجہ سے جو مشین کام نہیں کر رہی تھی وہ نیچے کی طرف چھید بنانے کے بعد بخوبی کام کرنے لگی۔

ہووے کی مشکل یہ تھی کہ وہ رواجی ذہن سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جو چیز ہزاروں سال سے چلی آرہی ہے وہی صحیح ہے۔ جب اس کے لاشعور نے اس کو تصویر کا دوسرا رخ دکھایا اس وقت وہ معاملہ کو سمجھا اور اس کو فوراً حل کر لیا۔ جب آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کسی کام میں لگا دے۔ تو وہ اسی طرح اس کے رازوں کو پا لیتا ہے جس طرح مذکورہ شخص نے پا لیا۔

دشمنی کے وقت بھی

روس اور امریکہ دونوں ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن ہیں۔ مزید یہ کہ دونوں نے بے حساب مقدار میں خطرناک نیوکلیر ہتھیار تیار کر رکھے ہیں جو منٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معمولی سی غلط فہمی دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان ایک ایسی جنگ چھیڑ سکتی ہے جو ان کے شاندار شہروں کو اچانک کھنڈر میں تبدیل کر دے۔

چنانچہ یہ ممالک ایک طرف ایک دوسرے کے خلاف ہر قسم کے انتہائی مہلک ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔ دوسری طرف دونوں کے درمیان پچھلے ۲۰ سال سے ہنگامی مواصلات (Emergency communications) کا ایک نظام قائم ہے جس کے ذریعہ رات دن کے کسی بھی لمحہ میں دونوں ایک دوسرے سے ربط پیدا کر سکتے ہیں۔ اور نازک مواقع پر فوراً براہ راست گفتگو کر کے جنگ کے اتفاقی خطرہ کو ٹال سکتے ہیں۔ اس ہر وقت متحرک رہنے والے مواصلاتی نظام کو گرم لائن (Hot-line) کہا جاتا ہے۔ نیوکلیر ہتھیاروں کی مزید ترقی کے بعد محسوس کیا گیا کہ قدیم گرم لائن بہت "سست" ہے۔ وہ ہتھیاروں کے رفتار سفر میں جدید ترقیوں کی نسبت سے جنگ کے فوری اندیشہ کو ٹالنے کے لئے سراسر ناکافی ہے۔ چنانچہ پچھلے ایک سال سے ماسکو اور واشنگٹن کے ماہرین اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ موجودہ گرم لائن کو ترقی دے کر اس کو وقت کے تقاضوں کے مطابق (Update) کیا جائے۔ بالآخر جولائی ۱۹۸۴ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک نئے معاہدہ پر سمجھوتہ ہو گیا (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ جولائی ۱۹۸۴)

اب تک جو ٹیلکس مشینیں ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان پیغام رسانی کے لئے استعمال ہو رہی تھیں وہ ایک منٹ میں ساٹھ الفاظ (ایک سکنڈ میں ایک لفظ) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتی تھیں۔ نئے معاہدہ کے تحت جو سسٹم رائج کیا گیا ہے اس کے مطابق ایک تیار شدہ مضمون (Prepared text) کے پورے ایک صفحہ کا عکس صرف ایک سکنڈ میں واشنگٹن سے ماسکو یا ماسکو سے واشنگٹن پہنچ جائے گا۔ گویا تیز رفتاری کے اعتبار سے پہلے کے مقابلہ میں کئی سو گنا زیادہ۔ اس طرح روس اور امریکہ نے خطرہ سے بچاؤ کی تدبیر کو خطرہ کے مطابق کر لیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندہ لوگ دشمنی کی آخری سطح پر پہنچ کر بھی کس قدر باہوش رہتے ہیں۔ دوسری طرف مردہ لوگ ہیں جن کو صرف یہ معلوم ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر لڑ جائیں اور پھر اپنی بے معنی لڑائی کبھی بھی حال میں ختم نہ کریں۔

کمینہ پن

ایک اعلیٰ سرکاری افسر کو اپنے ماتحت ملازم سے ضد ہوگئی۔ ملازم کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ خوددار قسم کا آدمی تھا اور افسر صاحب کی متکبرانہ نفسیات کو غذا نہیں فراہم کرتا تھا۔ وہ اس کو ملازمت سے تو نہیں نکال سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے کوشش کی کہ اس کو کسی قسم کی ترقی نہ ملنے پائے۔ جہاں کہیں دیکھتے کہ اس کے لئے ترقی اور کامیابی کی کوئی صورت پیدا ہورہی ہے وہ فوراً اس کے خلاف رکاوٹ بن کر کھڑے ہوجاتے۔ اس کو پروموشن کا موقع ملا جس سے اس کی تنخواہ میں تقریباً پانچ سو روپیہ مہینہ کا اضافہ ہوجاتا مگر انھوں نے زبردست سرگرمی دکھا کر اس کا پروموشن رکوادیا۔

اس ظلم کے باوجود افسر صاحب کی اپنی کوئی بات نہیں بگڑی۔ محکمہ کے بڑے بڑے لوگوں سے انھیں قدر دانی ملتی رہی۔ ان کے عہدہ اور مرتبہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ عالمی کانفرنسوں میں وہ اپنے محکمہ کی نمائندگی کے لئے بھیجے جاتے رہے وغیرہ

" اگر میں غلطی پر ہوتا تو مجھے یہ کامیابیاں کیسے ملتیں" انھوں نے سوچا۔ ماتحت ملازم کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں کے باوجود چوں کہ ان کی اپنی کوئی بات نہیں بگڑی تھی اس لئے وہ یہی سمجھتے رہے کہ میں صحیح ہوں میرے اوپر خدا کا فضل ہورہا ہے۔

مگر اس کی وجہ خدا کا فضل نہیں بلکہ صرف ان کا تضاد تھا۔ وہ اپنے ماتحت کے لئے کچھ تھے اور اپنے افسر کے لئے کچھ۔ اپنے ماتحت ملازم سے انھیں چوں کہ کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا اس لئے اس کے مقابلہ میں تو وہ شیر بنے رہتے۔ مگر اوپر کے وہ لوگ جن سے خود ان کی قسمت وابستہ تھی ان کے آگے وہ اس طرح بچھ جاتے جیسے کہ وہ نرمی اور تواضع کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

یہی وہ کردار ہے جس کا نام کمینہ پن ہے۔ اور کمینہ پن بے کرداری کی بدترین قسم ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے نیچے والوں کے لئے شیر بنے رہتے ہیں اور اپنے اوپر والوں کے لئے گیدڑ، وہ ایسا کر کے صرف اپنی پستی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیوں کہ انسان کو کیا ملے اور کیا نہ ملے، اس کا فیصلہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور خدا کے اوپر کسی کو اختیار نہیں۔

مزید یہ کہ دوسرے کے خلاف کیا ہوا ہر عمل خود اپنے خلاف عمل ہے۔ اپنی بارگاہ میں دوسرے کو ڈسکریڈٹ کرنے والا آدمی خدا کی بارگاہ میں اپنے آپ کو ڈسکریڈٹ کررہا ہوتا ہے۔ ایسا ہر سلوک خود اپنے ساتھ بدسلوکی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ خواہ اس کا ظہور موجودہ دنیا میں ہو یا بعد کو آنے والی دنیا میں۔

موقع نہ کھوئیے

" زندگی میں کامیاب ہونے کا راز یہ ہے کہ آدمی ہر آنے والے موقع کے لئے تیار رہے"
ڈزرائیلی کا یہ قول موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز بتا رہا ہے۔ دنیا میں کامیابی حقیقۃً اس کا نام ہے کہ آدمی حالات کو سمجھے اور آنے والے موقع کو فوراً استعمال کرے۔ جو شخص کسی موقع کو وقت پر استعمال نہ کر سکے وہی وہ شخص ہے جو ناکام رہا اور زندگی کی دوڑ میں پچھڑ گیا۔

شہر کی ایک گلی میں ایک بار میں نے دیکھا کہ بجلی کا بلب سارے دن جل رہا ہے۔ مگر دن کے اجالے میں وہ بالکل گم تھا۔ غور سے دیکھنے کے بعد اس کی روشنی بس اتنی نظر آتی تھی کہ آدمی یہ جان لے کہ یہاں ایک بلب موجود ہے۔ مگر جب رات آئی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو وہی بلب نمایاں ہو گیا۔ اب وہ اپنے ماحول کو اس طرح روشن کر رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا سورج زمین پر اتر آیا ہو۔

میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ ـــــ چراغ کی روشنی دراصل تاریکی کے موقع سے فائدہ اٹھانے کا دوسرا نام ہے۔ چراغ اسی وقت چراغ ہے جب کہ وہ تاریکی میں ہو۔ سورج کی روشنی ظاہر ہونے کے بعد چراغ کا کوئی وجود نہیں۔

تاریکی عام معنوں میں صرف "تاریکی" نہیں وہ ایک "موقع" ہے۔ تاریکی کو دیکھ کر آدمی اکثر فریاد و ماتم کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ تاریکی کسی آدمی کے لئے بہترین موقع ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں "تاریکی ہو وہاں کسی کے لئے اپنے آپ کو" روشن "کرنے کا ایک قیمتی موقع موجود ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی اس راز کو جانے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی کو وہی شخص اپنے لئے موقع بنا سکتا ہے جس کے پاس اپنی کوئی روشنی موجود ہو۔ جو شخص خود تاریکی ہو اس کے لئے تاریکی مزید اندھیرا لانے کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے لئے تاریکی کبھی موقع نہیں بنتی۔

چامیلس نے کہا ہے کہ" موقع کو کھو دینا کامیابی کو کھو دینا ہے۔" اگر آپ مسافر ہوں اور ٹرین پکڑنے کے لئے ریلوے اسٹیشن جائیں تو آپ کو چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ جب ٹرین آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو آپ فوراً اس کے اندر داخل ہو جائیں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو بیدار نہ رکھیں تو عین ممکن ہے کہ ٹرین آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو اور پھر سیٹی دے کر چلی جائے۔ اور آپ اس پر سوار نہ ہوئے ہوں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آپ زندگی کے جس میدان میں بھی ہوں، ہمیشہ آپ اس امتحان

یں ہوتے ہیں کہ مواقع کو پہچانیں اوران کو استعمال کر سکیں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو جاگتا ہوا نہ رکھیں تو موا قع آئیں گے اور آپ ان کو استعمال نہ کر سکیں گے۔ مواقع آپ کا انتظار کریں گے اور آپ کو ان کی خبر بھی نہ ہوگی اور پھر بعد کو بیٹھ کر زمانہ کی شکایت کریں گے کہ اس نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔

دنیا میں مواقع آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ تاہم ایک موقع ایسا ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ یہ امتیازی کارکردگی کا موقع ہے۔ حقیقت یہ کہ اس دنیا میں سب سے بڑا موقع وہ ہے جس کو امتیاز (Distinction) کہا جاتا ہے۔ کسی معاملہ میں امتیازی صلاحیت آدمی کو سب سے بڑا موقع فراہم کرتی ہے۔ دوسرے مواقع زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں۔ مگر " امتیاز " وہ موقع ہے جو ہمیشہ ہر آدمی کے لئے موجود رہتا ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے ڈینیل ویبسٹر (Daniel Webster) نے کہا ہے کہ چوٹی کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے؛

There is always room at the top.

اس دنیا میں سب سے بڑا موقع " امتیاز " ہے۔ دوسرے مواقع زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں۔ مگر امتیاز وہ موقع ہے جو ہمیشہ ہر مقام پر موجود رہتا ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

غصہ نہیں

کسی کا قول ہے کہ " غصہ آدمی کے چہرہ کو بگاڑ دیتا ہے "۔ اس قول کی سچائی دیکھنا ہو تو ایک کتے کو اس وقت دیکھئے جب کہ وہ دوسرے کتے سے بگڑ کر اس پر غرا رہا ہو۔ اس وقت کتا دنیا کا سب سے زیادہ بدشکل جانور دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس مثال پھول کی ہے۔ پھول کے سامنے کھڑے ہو کر آپ اس کو برا بھلا کہیں۔ اس کے باوجود اس کے حسن میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پھول آپ کے بُرا کہنے پر نہیں بگڑا۔ اس نے آپ کی کڑوی باتوں کا کوئی خراب اثر نہیں لیا۔

اسی بنا پر ایک مفکر نے کہا ہے کہ انسان سب سے زیادہ خوبصورت اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ ایک اشتعال انگیز بات پر غصہ نہ ہو۔ اور انسان سب سے زیادہ بدصورت اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اشتعال انگیز بات سنے اور پھر قابو سے باہر ہو جائے۔

ایک مثل ہے " غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ اور ندامت پر ختم ہوتا ہے "۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تصدیق غصہ کے ہر واقعہ سے کی جاسکتی ہے۔ جب بھی کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس غصہ کے علاوہ دوسرا جو طریقہ تھا وہ اس کو استعمال نہ کر سکا۔

ایک بار ایک لڑکے نے اپنے گھر میں کچھ نقصان کر دیا۔ اس کا جاہل باپ اس کو نظر انداز نہ کر سکا۔ وہ سخت غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو پکڑ کر زور سے دھکیلا تو اس کا سر جا کر دیوار سے ٹکرا گیا۔

اس کے سر کی کوئی رگ شدید طور پر متاثر ہوگئی۔ اس لڑکے نے ہمیشہ کے لئے اپنا حافظہ کھو دیا۔ وہ کسی کام کے قابل نہ رہا۔ بظاہر وہ دیکھنے میں پہلے کی طرح تھا مگر اب اس کو کوئی چیز یاد نہیں رہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بیکار ہو کر رہ گیا۔ باپ نے وقتی جذبہ سے مغلوب ہو کر ایک نادانی کی تھی مگر اپنے اس فعل پر بے پناہ شرمندگی اس کو ہمیشہ باقی رہی۔ اگر اس نے وقتی طور پر برداشت سے کام لیا ہوتا تو وہ مستقل شرمندگی سے بچ جاتا۔

داتا گنج بخش کا قول ہے کہ "غصہ عقل کو کھا جاتا ہے" گوسوامی تلسی داس نے کہا جہاں غصہ ہے وہاں بربادی ہے۔ ان دونوں اقوال کا مطلب ایک ہے۔ غصہ آدمی کی عقل کے لئے بھی قاتل ہے اور اس کے جسم کے لئے بھی۔ وہ اس کی پوری شخصیت کو نگل جاتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو غصہ سے بچائے۔

ڈاکٹر آلپورٹ نے بتایا ہے کہ غصہ کرنے سے عضلات (پٹھوں) کا تناؤ بڑھ جاتا ہے۔ جسم کی قوت غیر معمولی طور پر استعمال ہو کر تکان کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر آدمی کے اندر عمل کی قوت گھٹ جاتی ہے۔

دوسرے ڈاکٹر جے اے شنڈلر کا کہنا ہے کہ غصہ کی حالت میں آنتوں میں اینٹھن آجاتی ہے۔ دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر غصہ شدید ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ دماغ کی رگ پھٹ جائے اور آدمی کی اچانک موت واقع ہو جائے۔

چیسٹر فیلڈ نے نہایت گر کی بات کہی ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی شخص اگر اپنے غصہ پر قابو نہیں پا سکتا تو سمجھ لیجئے کہ وہ دنیا کا کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی چیز حاصل کرنے کے لئے دنیا پر قابو پانا پڑتا ہے۔ پھر جو شخص اپنے آپ پر قابو نہ پا سکے وہ دنیا پر قابو پانے میں کس طرح کامیاب ہوگا۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۸ - ۹ جولائی ۱۹۸۴ کو نشر کیا گیا۔

نظریۂ ارتقاء

چارلس ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) کے بعد عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اوّلاً موجودہ زمین ایک بے جان مادہ کی صورت میں وجود میں آئی۔ اس کے بہت عرصہ بعد تدریجی عمل کے نتیجہ میں زندگی کا ظہور ہوا۔ ارتقاء کے نظریہ کا یہی تقاضا تھا۔

کچھ لوگوں نے مزید آگے قدم بڑھایا اور ارتقائی مفروضات کی بنیاد پر قیاس کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی کہ زمین پر زندگی کا ظہور تقریباً ۵۰۰ ملین سال پہلے ہوا ہے۔ تاہم بعد کی تحقیقات نے ثابت کیا کہ یہ سائنسی مفروضہ بھی ویسا ہی بے بنیاد تھا جیسا مسیحی علماء کا بائبل کی بنیاد پر حساب لگا کر یہ فرض کر لینا کہ آدم صرف چھ ہزار سال پہلے ظہور میں آئے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد اس نظریہ پر مسلسل تنقید ہوتی رہی ہے۔ متعدد ماہرین نے یہ دکھایا ہے کہ زندگی اگر محض ارتقائی عمل کے ذریعہ وجود میں آئی ہو تو اس کے لئے مذکورہ مدت (۵۰۰ ملین سال) سراسر ناکافی ہے۔ حتیٰ کہ زمین کی پوری عمر بھی اس کے لئے ناکافی ہے کہ یہاں ارتقاء کا عمل جاری ہو اور ڈارون کے سہ گانہ اصول کے مطابق بالآخر زندگی کی اعلیٰ قسمیں وجود میں آئیں۔

اس سلسلے میں تازہ خبر یہ ہے کہ سوویت روس کی ۲۷ ویں انٹرنیشنل جیولاجیکل کانگرس کے تحت ۹ اگست ۱۹۸۴ کو ماسکو میں ایک سمپوزیم ہوا۔ اس موقع پر روسی سائنسداں بورس سوکولوف (Boris Sokolov) نے ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ میں خالص ریاضیاتی اور سائنسی دلائل سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ زمین پر زندگی زمین کی پیدائش کے وقت ۴۰۰۰ ملین سال پہلے بیک وقت شروع ہوئی۔ یعنی جب زمین وجود میں آئی عین اسی وقت زندگی بھی ظاہر ہو گئی (ہندستان ٹائمس ۱۱ اگست ۱۹۸۴)

اگر یہ مان لیا جائے کہ زمین اور زندگی دونوں ایک ساتھ ظہور میں آئے تو نظریۂ ارتقاء کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ یہاں ارتقاء کے حامی ایک دوگونہ مشکل میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ کہیں کہ زمین اور زندگی دونوں ایک ساتھ ظاہر ہوئے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر زندگی کے ارتقائی طور پر ظہور میں آنے کو کس طرح ثابت کریں اور اگر یہ مانیں کہ پہلے زمین بنی اس کے بعد ارتقائی عمل کے ذریعے دھیرے دھیرے زندگی کی قسمیں وجود میں آئیں تو انہیں نہیں معلوم کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دیں کہ زمین کی پیدائش سے اب تک کی مدت ان کے مفروضہ ارتقائی عمل کے لئے سراسر ناکافی ہے۔

کردار کا معاملہ

انسان مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ سادہ چیزوں کو استعمال کرکے شاندار شہر وجود میں لاتا ہے۔ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ اس کا راز صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے چیزوں کے اندر کچھ لازمی اوصاف کا ہونا۔ آدمی انھیں فطری خصوصیات کو دریافت کرکے انھیں کام میں لاتا ہے۔ یہ خصوصیات گویا چیزوں کا کیرکٹر (کردار) ہیں۔ ہر چیز کا ایک متعین کیرکٹر ہے جس کو وہ لازماً ادا کرتی ہے۔ یہی وہ کیرکٹر کی یقینیت ہے جس کی وجہ سے زندگی کی تمام سرگرمیاں اور ترقیاں ممکن ہوتی ہیں۔ اگر یہ یقینیت باقی نہ رہے تو اچانک پورا انسانی تمدن کھنڈر ہو کر رہ جائے گا۔

اگر ایسا ہو کہ ایک دریا کے اوپر لوہے کا پل کھڑا کیا جائے اور پھر معلوم ہو کہ وہ موم کی طرح نرم ہے۔ پتھر اور سمنٹ کے ذریعہ کئی منزلہ بلڈنگ بنائی جائے اور وہ ریت کا ڈھیر ثابت ہو۔ انجن میں پٹرول بھرا جائے مگر جب انجن کو چلایا جائے تو پٹرول توانائی میں تبدیل نہ ہو۔ مقناطیسی میدان (Magnetic Field) اور حرکت (Motion) کو یکجا کیا جائے مگر الکٹران متحرک ہو کر بجلی پیدا نہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔

اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چیزوں نے اپنا کیرکٹر کھو دیا ہے۔ اور اگر چیزیں اپنا متعین کیرکٹر کھو دیں تو تمدن کی تعمیر ناممکن ہو جائے۔ تمدن اسی وقت بنتا ہے جب کہ اس کے ضروری مادی اجزاء اس کردار کو ادا کریں جس کی ان سے توقع کی گئی ہے۔ اگر برف کی فیکٹری میں پانی جمنے کے بجائے بھاپ بن کر اڑنے لگے تو آئس فیکٹری کا وجود بے معنی ہو جائے گا۔ اگر بھٹی میں لوہا ڈالا جائے اور وہ پگھلنے سے انکار کر دے تو سارا اشینی کاروبار درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

ٹھیک یہی معاملہ انسانی اجتماعیت کا بھی ہے۔ کسی اجتماعی نظام میں جو افراد منسلک ہوتے ہیں ان میں سے ہر فرد کو اپنے اپنے مقام پر کوئی کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسی کردار کی صحیح ادائگی پر اجتماعیت کے قیام کا انحصار ہے۔ جس طرح مادی چیزوں کی قیمت ان کے مخصوص کیرکٹر کی بنا پر ہے۔ اسی طرح انسان کی قیمت بھی اس میں ہے کہ وہ مختلف مواقع پر اس کیرکٹر کا ثبوت دے جس کی بحیثیت انسان اس سے امید کی جاتی ہے۔ وہ ہر موقع پر انسان ثابت ہو نہ کہ غیر انسان۔

ایک انسان کو جہاں وعدہ پورا کرنا چاہئے وہاں وہ وعدہ خلافی کرے۔ جہاں اس کو شرافت کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے وہاں وہ کمینہ پن کا طریقہ اختیار کرے۔ جہاں اس کو فیاضی دکھانا چاہئے وہاں وہ تنگ ظرفی کا ثبوت دے۔ جہاں اس کو بڑاپن کا مظاہرہ کرنا چاہئے وہاں وہ چھوٹاپن دکھائے۔ جہاں اس کو

معاف کر دینا چاہئے وہاں وہ انتقام لینے لگے۔ جہاں اس کو اطاعت کرنا چاہئے وہاں وہ سرکشی کرنے لگے۔ جہاں اس کو اعتراف کر لینا چاہئے وہاں وہ ہٹ دھرمی دکھانے لگے۔ جہاں اس کو اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرنا چاہئے وہاں وہ اس کی پردہ دری کرنے پر تل جائے۔ جہاں اس کو ایثار سے کام لینا چاہئے وہاں وہ خود غرضی سے کام لینے لگے۔

اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں نے اپنا انسانی کردار کھو دیا ہے۔ وہ اس امید کو پورا نہیں کر رہے ہیں جو اجتماعی نظام کا ایک جزء ہونے کے اعتبار سے ان سے قائم کی گئی تھی۔ جس اجتماعی معاشرہ کا یہ حال ہو کہ اس کے افراد اپنا انسانی کردار کھو دیں وہاں صرف انتشار کا راج ہوگا، وہاں کوئی مستحکم اجتماعی نظام نہیں بن سکتا۔

کوئی طاقتور نظام یا ایک اچھا معاشرہ اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کے انسان حقیقی معنوں میں انسان ثابت ہوں۔ جہاں پختگی کی ضرورت ہے وہاں وہ لوہے کی طرح پختہ بن جائیں۔ جہاں نرمی کی ضرورت ہے وہاں وہ چشمہ کی طرح نرم ثابت ہوں۔ جہاں چپ رہنے کی ضرورت ہے وہاں وہ پتھر کی طرح خاموش ہو جائیں۔ جہاں ٹھہرنے کی ضرورت ہے وہاں وہ پہاڑ کی طرح جم کر کھڑے ہو جائیں۔ جہاں اقدام کی ضرورت ہے وہاں وہ سیلاب کی طرح رواں بن جائیں۔ وہ ہر موقع پر وہی بولیں جو انھیں بولنا چاہئے۔ اور ہر موقع پر وہی ثابت ہوں جو انھیں ثابت ہونا چاہئے۔

ایسے انسان اجتماعی زندگی کے لئے اسی طرح اہم ہیں جس طرح لوہا اور پٹرول تمدنی زندگی کے لئے۔ لوہا اور پٹرول کے بغیر کوئی تمدن نہیں۔ اسی طرح پختہ کردار آدمیوں کے بغیر کوئی اجتماعی زندگی نہیں۔

مشن میں شرکت

اگر آپ الرسالہ کے پیغام سے متفق ہیں اور پھر بھی آپ نے ابھی تک الرسالہ کی ایجنسی نہیں لی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ——— آپ نے اس مشن میں اپنے آپ کو شامل نہیں کیا۔ جو شخص بھی الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھتا ہو اس کے اتفاق کا کم سے کم تقاضا ہے کہ وہ الرسالہ کی ایجنسی لے۔

ادارہ الرسالہ

فہم قرآن

فی صحیح البخاری من روایۃ ابی جحیفۃ وھب بن عبد اللہ السوائی۔ قال قلت لعلی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ ھل عندکم شئ من الوحی مما لیس فی القرآن۔ فقال لا والذی فلق الحبۃ وبرأ النسمۃ الا فھماً یعطیہ اللہ رجلاً فی القرآن (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۷۷)

وہب بن عبد اللہ تابعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی ابن ابی طالب سے پوچھا۔ کیا آپ کے پاس وحی الٰہی میں سے کوئی ایسی چیز ہے جو قرآن میں نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو پھاڑا اور جاندار کو وجود بخشا، ہمارے پاس کوئی مزید چیز نہیں سوا اس فہم کے جو اللہ ایک شخص کو قرآن میں عطا کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں ظاہری الفاظ کے سوا بھی ایک چیز ہے اور وہ اس کی گہری معنویت کا ادراک ہے، گویا ایک الفاظ قرآن ہے اور دوسرا فہم قرآن۔ قرآن کا لفظی حصہ اس کے ظاہری مطالعہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے معنوی حصہ کو پانے کے لئے غور وفکر ضروری ہے۔ گہرے تدبر کے بغیر کوئی شخص قرآن کے گہرے معانی کو نہیں جان سکتا۔

قرآن کے ظاہری پہلو کو جاننے کے لئے عربی دانی کی ضرورت ہے اور قرآن کے معنوی پہلو کو جاننے کے لئے خدادانی کی۔ اگر آدمی کو عربی زبان سے واقفیت ہو تو وہ قرآن کو پڑھ کر اس کے ظاہری مفہوم کو سمجھ لے گا۔ مگر قرآن کی معنوی گہرائیوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جو خدا کی چھپی ہوئی تجلیات سے اپنی آنکھوں کو روشن کر چکا ہو۔

دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک قرآن وہ ہے جو آدمی کو لکھی ہوئی کتاب کی صورت میں مل جاتا ہے۔ اور دوسرا قرآن وہ ہے جس کو اسے خود دریافت کرنا ہے۔ ایک قرآن وہ ہے جو آیتوں کا ترجمہ جاننے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرا قرآن وہ ہے جس کو خود اپنی کوششوں سے پانا پڑتا ہے۔

آدمی اگر صرف "پہلے قرآن" کو پائے تو قرآن سے اس کا تعلق اوپری انداز کا ہوگا۔ وہ بے روح طور پر اس کو مانتا رہے گا۔ مگر جو شخص "دوسرے قرآن" کو پالے اس کو قرآن سے زندہ تعلق ہو جاتا ہے۔ قرآن اس کے لئے حرکت اور یقین کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ قرآن اس کے لئے ایک ایسی چیز بن جاتا ہے جس میں وہ جئے، جس سے وہ اپنے لئے غذا حاصل کرے۔

علم اور تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور وہ تم کو علم دے گا (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ ، البقرۃ ۲۸۲) دوسرے مقام پر کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈروگے تو وہ تم کو پہچان دے گا (ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا) ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے ڈرو... وہ تم کو روشنی عطا فرمائے گا جس میں تم چلوگے (... ویجعل لکم نوراً تمشون بہ،

امام مالک نے امام شافعی سے ان کی جوانی کی عمر میں نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: اے لڑکے، میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے تمہارے دل کو روشنی سے بھر دیا ہے تو تم اس کو گناہ کی تاریکی سے نہ بجھاؤ (یا فتی انی اریٰ اللہ قد ملأ قلبک نوراً فلا تطفئہ بظلمۃ المعصیۃ)

امام شافعی نے اپنے استاد وکیع بن الجراح سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر اس طرح اشعار میں کیا ہے:

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی　　　فارشدنی الی ترک المعاصی

واخبرنی بان العلم نور　　　ونور اللہ لا یہدی لعاصی

میں نے شیخ وکیع سے حافظہ کی خرابی کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے نصیحت کی کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور انھوں نے مجھے بتایا کہ علم روشنی ہے اور اللہ کی روشنی کسی گناہگار کو راستہ نہیں دکھاتی۔

یہاں علم سے مراد معلومات نہیں، معرفت ہے۔ ایک حقیقی معرفت تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی کے پاس الفاظ اور معلومات کا ذخیرہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر صحت فکر ہو۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر یہی صحت فکر پیدا کرتا ہے۔

آدمی جتنا زیادہ سنجیدہ ہوتا ہی زیادہ اس کے اندر صحت فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اللہ کا ڈر آدمی کو سب سے زیادہ اس قابل بناتا ہے کہ وہ صحیح اور درست طریقہ پر سوچ سکے۔

اللہ کا ڈر آدمی کے الفاظ اور معلومات کے لئے ایسا ہی ہے جیسے سانچہ خام اشیاء کے لئے۔ سانچہ خام اشیاء کو بامعنی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کا ڈر الفاظ اور معلومات کو معرفت میں ڈھال دیتا ہے۔

کچھ علوم انسانی مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں اور کچھ علوم خدا کے مدرسہ میں۔

صرف الفاظ

امریکہ میں اگلی میعاد کے لئے صدر کے انتخاب کی مہم چل رہی تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے ایک خاتون فیرارو (Geraldine Ferraro) کو صدارت کے لئے اپنا نمائندہ بنایا۔ ٹائم میگزین نے مذکورہ خاتون کی زبردست حمایت کی۔ ٹائم (۲۳ جولائی ۱۹۸۴) میں مذکورہ خاتون کی حمایت میں ایک مفصل مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا:

A Break with Tradition

ٹائم کی اس اشاعت میں کئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کچھ امریکی خواتین ایک بورڈ سر پہ اٹھائے ہوئے کھڑی تھیں۔ بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ بہتر کل کے لئے فرارو کو ووٹ دو:

Ferraro, For A Better Tommorrow

اسی طرح نیو سنڈے ٹائمس (کوالالمپور) کی اشاعت ۲۹ جولائی ۱۹۸۴ میں ایک قصہ پڑھا کہ امریکہ کے میگزین پنٹ ہاؤس *(Pent House)* نے ایک سنسنی خیز واقعہ کیا۔ اس نے پہلی نیگرو مس امریکہ وینشا ولیمس (Vanessa Williams) کو راضی کر کے اس کی بہت سی ننگی تصویریں لیں اور ان تصویروں کو چھاپ کر کروڑوں روپئے کمائے۔ مذکورہ امریکی اخبار نے ان تصاویر کے اوپر جو عنوان قائم کیا وہ یہ تھا کہ وینشا بغیر لباس:

Vanessa The Undressa

فرارو کے حامیوں نے اپنے سیاسی مدعا کو نہایت موزوں الفاظ میں ڈھال لیا۔ اسی طرح وینیا کی ننگی تصویروں کی تجارت کرنے والوں کو بھی اپنے موافق الفاظ مل گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ اس دنیا میں سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ الفاظ میں اتنی گنجائش ہے کہ جو شخص بھی چاہے اپنے خیالات کے لئے دلفریب الفاظ پالیتا ہے۔

ہر آدمی اپنی بات کو خوب صورت الفاظ میں ڈھال کر سمجھتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ حالاں کہ کسی بات کا خوب صورت الفاظ میں ڈھل جانا اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ وہ فی الواقع بھی حقیقت ہے۔ آخر کار کامیابی صرف اس شخص کو ملے گی جس کے پاس حقیقت ہو نہ کہ اس شخص کو جس کے پاس صرف الفاظ ہوں۔ مگر حقیقت اس کے پاس موجود نہ ہو۔

فطرت کا اعتراف

کارل لیویس امریکا کا ایک مشہور کھلاڑی ہے۔ لاس اینجلس میں دوڑ کا عالمی مقابلہ ہوا۔ اس میں ۲۲ جون ۱۹۸۴ کو کارل لیویس نے اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی کے بعد کارل لیو بس کی ایک تصویر اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس تصویر کا عکس ہم مقابل کے صفحہ پر نقل کر رہے ہیں۔

اس تصویر میں کارل لیو بس بالکل سجدہ کی حالت میں دکھائی دے رہا ہے جس پٹری پر دوڑ کر اس نے یہ مقابلہ جیتا تھا، اس پٹری کے لئے اس کے دل میں عقیدت اور احسان مندی کا اتنا شدید جذبہ پیدا ہوا کہ پٹری پر اپنی پیشانی رکھ کر وہ سجدہ میں گر پڑا۔

یہ ایک تازہ مثال ہے جو بتاتی ہے کہ انسانی فطرت میں کس طرح یہ جذبہ چھپا ہوا ہے کہ وہ کسی کو اپنا محسن سمجھے اور اس کے آگے اپنے بڑھے ہوئے جذبات عقیدت کو پیش کر سکے۔

یہ جذبہ انسانی فطرت کا سب سے گہرا جذبہ ہے۔ کوئی بھی انسان اس سے خالی نہیں، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب۔ انسانی فطرت کا علمی مطالعہ کرنے والے ماہرین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ جذبہ انسانی فطرت میں اس طرح پیوست (Interwoven) ہے کہ اس کو کسی بھی طرح انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جذبہ دراصل خدا کی پرستش کا جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا مرجع حقیقۃً وہ ہستی ہے جو انسان کی خالق ہے۔ یہ جذبہ اس لئے ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک کو پہچانے۔ وہ اس کی عظمت کا اعتراف کرے۔ وہ اس اس کے آگے اپنے آپ کو ڈال دے۔

مگر انسان فطرت کے راستہ سے انحراف کرتا ہے۔ جو چیز خدا کو دینا چاہئے وہ اسے دوسروں کو دیتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام شرک ہے۔ آدمی اگر اپنے فطری جذبات کا مرجع ایک خدا کو بنائے تو یہ توحید ہے اور اگر وہ اس کا مرجع کسی دوسری زندہ یا مردہ چیز کو بنائے تو یہ شرک ہے۔ توحید انسانی فطرت کا صحیح استعمال ہے اور شرک انسانی فطرت کا غلط استعمال۔

انسان عین اپنی فطرت کے زور پر مجبور ہے کہ وہ کسی کو اپنا "خدا" بنائے۔ حقیقی خدا چوں کہ ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اس لئے وہ دکھائی دینے والی چیزوں کو خدا سمجھ لیتا ہے۔ جو کچھ خدا کو دینا چاہئے وہ اسے غیر خدا کو دے دیتا ہے۔

10 THE TIMES OF INDIA, TUESDAY, JUNE 26, 1984



Carl Lewis kisses the track after winning the 200 meters at the recent U.S. Track and Field trials. With victory Lewis assured himself of a crack at Jesse Owens' record of four gold medals at the Berlin Olympics in 1936. Lewis had earlier qualified for the 100 meters, the long jump and the 4 x 100 meters relay. AP.

نفاذ شریعت

اسلام کا شرعی قانون آج اگرچہ کہیں پوری طرح نافذ نہیں۔ تاہم اگر کہیں وہ جزئی طور پر بھی نافذ ہے تو اس کے نتائج بتاتے ہیں کہ وہ انسانی سماج کے لئے رحمت ہے۔ اس کی ایک مثال موجودہ زمانہ میں سعودی عرب ہے جہاں اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق جرائم کی تعداد تمام دنیا میں سب سے کم ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہاں کی عدالتوں میں شرعی قانون نافذ ہے۔

تاہم مسلمانوں کا جدید طبقہ اس سلسلہ میں کچھ شبہات وارد کرتا ہے۔ یہ شبہات خاص طور پر دو قسم کے ہیں :

۱. شریعت میں اختلافات ہیں، پھر اس کو عملاً نافذ کرنے کی صورت کیا ہوگی

۲. زمانہ بدل گیا ہے، اس لئے شرعی قانون آج کے لئے مفید نہیں

مسلم رہنماؤں کی ایک عالمی کانفرنس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مسلم ممالک میں شریعت اسلامی کا نفاذ کیا جائے تو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا :

ایّ شریعة نطبق ۔ هل نطبق مذهب الامام احمد او مذهب الشافعی او مذهب مالك او ابی حنیفة۔	ہم کس شریعت کو نافذ کریں گے۔ کیا امام احمد کا مذہب یا امام شافعی کا مذہب یا امام ابوحنیفہ کا مذہب۔

الشرق الاوسط (الریاض) ۲۸ جنوری ۱۹۸۴

اس سوال میں ایک مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ اس قسم کے لوگ "شریعت" اور "فقہ" دونوں کو ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی جزئیات میں اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ خود شریعت میں اختلاف ہے۔ نیز وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ مختلف فقہی مذاہب محض جزئی امور میں اختلاف کی بنا پر الگ الگ شمار ہوتے ہیں نہ کہ اصولی اور اساسی امور میں اختلاف کی بنا پر۔

فقہاء کے درمیان اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ تشریع کا ماخذ قرآن اور سنت ہے اور اس کے بعد اجماع اور قیاس۔ (اجماع حقیقۃً کوئی مستقل چیز نہیں، وہ قیاس ہی کی کامل اور متفق علیہ صورت ہے)۔

فقہ اسلامی میں احکام کی جو تدوین ہوئی ہے، ان کا ایک حصہ وہ ہے جو کتاب و سنت سے براہ راست طور پر (عبارت النص سے) اخذ ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس کی بنیاد قیاس ہے یعنی کتاب و سنت میں مذکور احکام سے استنباطی طور پر مزید احکام کا استخراج۔

جہاں تک احکام کے حصہ اوّل کا تعلق ہے، ان میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ صرف دوسری قسم کے احکام میں ہے اور یہ دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جو فروع یا تفصیلی جزئیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اختلاف عین وہی چیز ہے جو تمام دنیا کے قوانین میں پایا جاتا ہے، خواہ وہ مذہبی قانون ہو یا غیر مذہبی قانون۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ قانون کی تفصیلی جزئیات میں ججوں اور ماہرین قانون کے درمیان ہمیشہ رایوں کا اختلاف رہتا ہے۔

اس کے باوجود ان قوانین پر بڑی بڑی حکومتوں کا نظام چل رہا ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت کا نظام بھی یقینی طور پر کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن میں یہ حکم ہے کہ جو شخص چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس حکم کی تفصیلی صورت مقرر کرنے میں فقہاء کے درمیان اختلافات ہیں۔ مگر وہ صرف اس لئے ہیں کہ مختلف حالات میں حکم کی تطبیق میں فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ حد مقرر کرنا کہ کتنی مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے۔ قحط کی حالت میں اور افراط کی حالت میں کیا نسبت رکھی جائے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں یہ اختلاف کہ ہاتھ کو روایتی طور پر عام چھری سے کاٹا جائے یا آپریشن کے اصول پر کاٹا جائے۔ وغیرہ۔

اس قسم کے اختلافات سے اصل حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ اس سے شریعت میں توسع اور لچک ثابت ہوتا ہے جو انسانوں کے لئے رحمت ہے جیسا کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا:

ما سرنی ان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لم یختلفوا۔ لانھم لو لم یختلفوا لم تکن رخصۃ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اختلاف نہ کرتے تو میرے لئے اس میں خوشی نہیں تھی کیونکہ اگر وہ اختلاف نہ کرتے تو رخصت نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرا اعتراض مذکورہ تعلیم یافتہ بزرگ کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

الشریعۃ انما تصلح لزمان سابق ولا تصلح لعصرنا ھذا۔

شریعت قدیم زمانہ کے لئے مفید تھی مگر وہ ہمارے موجودہ زمانہ کے لئے مفید نہیں۔

فقہاء کا اختلاف ظاہر کرتا ہے کہ شریعت کے تفصیلی امور میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ فقہاء کا اختلاف دراصل اجتہاد کا اختلاف ہے۔ یہی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شریعت ہر زمانہ کے لئے قابل نفاذ ہے۔ شریعت کی تفصیلات میں اختلاف ہونا اس کے توسع کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ اس امکان کو بتاتا ہے کہ اس کے عملی انطباق میں ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو زمانہ کی تبدیلی کے بعد شریعت کے نفاذ کے لئے مطلوب ہے۔ پھر شریعت کا بدلے ہوئے زمانہ میں قابل نفاذ ہونا مشکوک کیوں۔

حق کی دعوت

آجکل ہر آدمی دعوت حق کا نام لیتا ہے مگر دعوت حق ابھی تک وجود میں نہیں آئی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس کی قیمت ادا کرنا نہیں چاہتے۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے اور دعوت حق کی بھی ایک قیمت ہے۔ جب تک وہ قیمت ادا نہ کی جائے دعوت حق کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

حق کی دعوت دینے کی لازمی شرط یہ ہے کہ غیر حق کو چھوڑ دیا جائے ـــــــ خدا کی بڑائی بیان کرنے کے لئے اٹھنا اور انسانوں کی بڑائی میں گم رہنا، آخرت کا داعی بننا اور دنیا کے مفادات کے لئے قوموں سے کش مکش کرنا، ابدی مسائل کی بات کرنا اور اسی کے ساتھ وقتی مسائل میں الجھے رہنا، یہ سب تضاد کی باتیں ہیں اور جو لوگ اپنے اندر تضاد لئے ہوئے ہوں وہ کبھی حق کے داعی نہیں بن سکتے۔

اس قسم کا ہر واقعہ بتاتا ہے کہ لوگ " داعی حق " کا ٹائٹل لینے کے لئے تو دوڑ پڑے ہیں مگر وہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

لوگوں کو اپنی مفروضہ شخصیتیں اتنی زیادہ محبوب ہیں کہ ان پر ادنی تنقید سننا بھی انھیں گوارا نہیں۔ لوگوں کو اپنے دنیا کے مفادات اور مصلحتوں سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ ان کو کسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتے ۔ جو قومیں اسلام کے پیغام رحمت کی مخاطب ہیں ان سے وہ قومی اور مادی لڑائی چھیڑ کر انھیں اسلام سے بدکائے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی چیزوں کے ساتھ حق کی دعوت کا نام لینا صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ آدمی حق کی دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں۔

حق کی دعوت ابدی صداقتوں کی دعوت ہے۔ حق کی پکار خدا اور آخرت کی پکار ہے۔ یہ ایک نہایت نازک کام ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا کام جمع نہیں ہوسکتا۔

حق کا داعی لوگوں کو موت اور قیامت کے بھیانک مسئلہ سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کو ہر واقعہ میں آخرت کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ وہ گرمی کی شدت دیکھتا ہے تو اس میں اس کو نار جہنم کی شدت دکھائی دیتی ہے۔ اس کو معاشی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے تو وہ بھی اس کو آخرت کی تکلیف یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو " ظلم " کے خلاف چیختے ہوئے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ لوگو ، اس دن کو یاد کرو جب تمھارے پاس زبان بھی نہ ہوگی کہ تم بولو اور پانی کا ایک گلاس بھی نہ ہوگا جس سے تم اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کرو۔

قومی عظمت

رومی شہنشاہیت کا زوال (Decline and Fall of the Roman Empire) ایڈورڈ گبن کی مشہور کتاب ہے۔ انگریز مورخ کو یہ کتاب لکھنے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا خیال اس کو اس وقت آیا جب کہ اس نے روم کے کھنڈرات دیکھے۔ رومی شہنشاہیت کے کھنڈرات میں اس نے یورپ کی عظمتِ ماضی کا نشان دیکھا۔ اور اس کے برباد ہو جانے کا مشاہدہ کیا۔

اس مشاہدہ نے ایڈورڈ گبن کے دل میں تڑپ پیدا کی۔ وہ اس موضوع کی تحقیق میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ اس نے وہ کتاب لکھی جو کہ نہ صرف رومی سلطنت کی اہم تاریخ ہے بلکہ خود تاریخ نویسی پر خالص فنی اعتبار سے ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح تاریخ کے موضوع پر سر سید کی مشہور کتاب آثار الصنادید (۱۸۴۷) ہے۔ سر سید کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال بھی عظمت ماضی کے "کھنڈرات" کو دیکھ کر ہوا۔ دہلی کی منصفی کے زمانہ میں سر سید نے دہلی کی تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ ان عمارتوں میں انھوں نے سنسان عظمت کا جو مشاہدہ کیا اس نے ان کے اندر ایک تڑپ پیدا کر دی۔ انھوں نے دہلی کی ایک ایک عمارت کی تحقیق شروع کر دی۔ چھٹیوں کو وہ اس طرح استعمال کرتے کہ دہلی کے اطراف کی عمارتوں کو دیکھنے نکل جاتے اور کئی کئی دن تک ان کی تحقیق میں مشغول رہتے۔

اس تحقیق میں انھوں نے غیر معمولی محنت کی۔ بہت سی قدیم عمارتیں اس قدر بوسیدہ تھیں کہ ان کے کتبے بھی بوسیدہ ہو چکے تھے۔ بہت سے کتبوں سے پوری معلومات حاصل نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ کتبے ایسے خط میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ کتبوں پر جو نام درج تھے ان کی تاریخی کتابوں سے تحقیق کرنی پڑتی تھی۔ انھوں نے ان تمام مشکلات کو جھیلا۔ انھوں نے ہر عمارت کے طول و عرض کی پیمائش کی۔ اس کے حالات لکھے۔ کتبوں کے چربے اتارے۔ ہر عمارت کا نقشہ مصور سے بنوایا کیونکہ اس زمانہ میں کیمرہ موجود نہ تھا۔ اس طرح انھوں نے تقریباً سوا سو عمارتوں کی تفصیلات مرتب کیں۔

قطب مینار کی غیر معمولی بلندی قدیم زمانہ میں کسی محقق کے لئے زبردست مسئلہ تھی۔ سر سید نے قطب مینار کے اونچے کتبوں کو پڑھنے کے لئے دو بلیاں لگوا کر ان میں چھینکے لٹکوائے اور اس کے اندر بیٹھ کر اوپر گئے اور کتبوں کی نقل تیار کی۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ سر سید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی:

ویصعد حتی یظن الوریٰ بان لہ حاجۃ فی السماء

(وہ اس طرح اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان میں کچھ ضرورت ہے)

عظمت ماضی کے کھنڈر کو دیکھ کر جس طرح گبن اور سرسید مورخ بن گئے۔ اسی طرح بہت سے لوگ ہیں جن کو عظمت ماضی کے کھنڈر نے لیڈر اور مفکر بنادیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوتے جب کہ مسلمانوں کو زوال آچکا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے دور عظمت کے کھنڈر دیکھے۔ ان کھنڈرات کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے۔ کھوئی ہوئی عظمت کے شکستہ مناظر کو دیکھ کر ان کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔

تاہم ان کی بھیڑ میں کوئی نظر نہیں آتا جس نے جنت کے باغوں کو لہلہاتے ہوئے دیکھا ہو اور جہنم کے شعلوں کی لپٹ محسوس کرکے تڑپ اٹھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں آخرت کی دعوت کی کوئی حقیقی تحریک نہ اٹھ سکی۔ البتہ قومی عظمت کو حاصل کرنے کی تحریکیں اتنی زیادہ ابھر آئیں کہ ان کے شور سے شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں کان بہرے نہ ہو جائیں۔

متفقین سے گزارش

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ ایک مشن ہے۔ جو لوگ اس مشن سے متفق ہیں ان سے ہماری درخواست ہے کہ حسب ذیل پروگرام میں شرکت کرکے ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔

۱۔ ماہنامہ الرسالہ کی ایجنسی قائم کریں (شرائط ایجنسی آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

۲۔ الرسالہ کے ادارہ سے چھپی ہوئی کتابیں لوگوں کے درمیان پھیلائیں۔

۳۔ اجتماعات کے مواقع پر بک اسٹال لگائیں جس میں الرسالہ اور کتابیں رکھی جائیں۔

۴۔ متفقین کو جوڑ کر ہفتہ وار اجتماع کریں۔

۵۔ مساجد اور دوسرے اجتماعی مقامات پر تذکیر القرآن پڑھ کر سنائیں۔

۶۔ مختلف علاقائی زبانوں میں الرسالہ کی مطبوعات کے ترجمے شائع کریں۔

سکریٹری اسلامی مرکز

آرزوؤں کی دنیا

جنّت کا انکار اپنے آپ کا انکار ہے۔ جو شخص جنت کو نہیں مانتا وہ خود اپنی نفی کر رہا ہے۔ جو شخص جنت کو مانتا ہے مگر اس کے لئے عمل نہیں کرتا وہ ایسا خریدار ہے جو ایک چیز خریدنا چاہتا ہے مگر اس کی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں۔

ہر انسان سب سے زیادہ کیا چاہتا ہے۔ ہر انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو پا سکے ـــــ وہ ابدی طور پر جیتا رہے۔ وہ اپنی تمام آرزوؤں کی تکمیل کر سکے۔ وہ ایسی زندگی کا مالک بنے جو ہر قسم کی محدودیت (Limitations) اور ناخوشگواری (disadvantage) سے خالی ہو۔

یہ آدمی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ ہر آدمی اپنی اس تمنا کی تکمیل کے لئے دوڑ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی آدمی اپنی اس تمنا کو پورا نہیں کر پاتا۔ آدمی اپنی صحت بناتا ہے مگر بہت جلد اس کی صحت کسی حادثہ یا بڑھاپے کا شکار ہو جاتی ہے۔ آدمی دولت جمع کرتا ہے مگر دولت اس کے قلب و دماغ کو سکون نہیں دیتی۔ وہ اقتدار پر قبضہ کرتا ہے مگر اقتدار صرف اس کے مسائل میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ وہ عیش و عشرت کے سامان اکٹھا کرتا ہے مگر جلد ہی وہ اکتاہٹ (Boredom) کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہر آدمی اپنے لئے ایک جنت کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ مگر وہ اپنی جنت بنا نہیں پاتا کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو لئے ہوئے موجودہ دنیا سے چلا جاتا ہے۔

آدمی موت کے بعد کہاں جاتا ہے۔ وہ وہاں جاتا ہے جہاں اس کے خوابوں کی جنت بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ جنت اس شخص کو ملتی ہے جس نے موت سے پہلے والی زندگی میں اس کی قیمت ادا کی ہو۔ جو شخص موجودہ دنیا میں جنت کی قیمت ادا نہیں کرتا وہ گویا اسی چیز کی محرومی کا خطرہ مول لے رہا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔

جنت ہماری آرزوؤں کا محل ہے۔ مگر جنت صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جس نے اس کو آخرت میں تعمیر کیا ہو۔ جو شخص اپنی جنت موجودہ دنیا میں تعمیر کرے اس کے لئے ابدی محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جب کہ آدمی عین اسی چیز سے ابدی طور پر محروم ہو جائے جس کے لئے وہ ساری عمر سب سے زیادہ آرزومند بنا ہوا تھا۔

محبت کا نذرانہ

قرآن کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے : اور بعض انسان وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنا چاہئے۔ اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری قوت اللہ ہی کے لئے ہے، اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (البقرہ ۱۶۵)

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ خارجی سہارا چاہتا ہے ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے۔ اور اس کے لئے اعتماد و یقین کی بنیاد ہو۔ کسی کو اس حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنا اس کو معبود بنانا ہے جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور عقیدت کے جذبات اس کے لئے خاص ہو جاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ کسی سے حب شدید کرے اور جس سے کوئی شخص حبّ شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔

موجودہ دنیا میں چوں کہ خدا نظر نہیں آتا اس لئے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ مقام دے دیتا ہے جو دراصل خدا کو دینا چاہئے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں جن کو آدمی "بڑا" سمجھ لیتا ہے اور پھر وہ دھیرے دھیرے لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ لوگ اس طرح ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں جیسا گرویدہ انھیں صرف خدا کا ہونا چاہئے۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقۃً اس لئے تھا کہ اس کو خدا سے پر کیا جائے وہاں کسی غیر خدا کو بٹھا لیا جاتا ہے۔

انسان کے پاس کسی کو دینے کے لئے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ محبت ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص خدا جیسی باکمال ہستی کو پائے اور اس کی خدمت میں محبت سے کم تر درجہ کی کوئی چیز پیش کرے۔ محبت سے کم کوئی چیز نہ تو خدا قبول کرتا اور نہ کسی انسان کے لئے جائز ہے کہ وہ خدا کے حضور میں محبت سے کم کسی چیز کا نذرانہ پیش کرے۔ اپنی چیزوں میں سے کم تر چیز کا ہدیہ خدا کو پیش کرنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے خدا کو اس کے جلال و کمال کے ساتھ پایا ہی نہیں۔

غلط ذہن

دہلی کے ایک مسلم محلہ میں ایک اردو پوسٹر نظر سے گذرا۔ سرخی یہ تھی:

"آگ اور خون میں نہائے ہوئے ہندستانی مسلمان سوال کرتے ہیں"

یورپ کے سفر میں ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ ایک پرجوش نوجوان عربی اور انگریزی میں چھپا ہوا ایک کتابچہ تقسیم کر رہے ہیں۔ اس کے صفحۂ اول پر یہ الفاظ درج تھے:

"ہندستان جو مسلمانوں کے لئے عظیم مذبح بن چکا ہے"

ہندستان میں جزئی طور پر ضرور ایسے بعض واقعات ہوئے ہیں جن پر مذکورہ بالا الفاظ صادق آتے ہیں۔ مگر پورے ملک کے بارہ میں اس قسم کے الفاظ بولنا سراسر خلاف واقعہ ہے۔ اور جو لوگ خلاف واقعہ بات پر اپنی عمارت کھڑی کرنا چاہیں وہ یقینی طور پر خدا کی مدد نہیں پا سکتے۔

اس طرح سوچنے اور بولنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی کبھی مسئلہ کے صحیح حل تک نہیں پہنچتا۔ "مسئلہ کا حل کیا ہے" اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی یہ جانے کہ "مسئلہ کی نوعیت کیا ہے"۔ مسئلہ کی نوعیت کو جانے بغیر مسئلہ کا حل متعین نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ طرز پر سوچنے والے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ مسئلہ کی نوعیت دریافت نہ کر سکے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ مسئلہ کا حل پا سکیں۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ یہ طرز کلام آدمی سے حقیقت پسندی چھین لیتا ہے۔ دنیا کا نظام اس کے پیدا کرنے والے نے کامل حقیقت پسندی کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ یہاں کوئی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے اصول فطرت سے کلی مطابقت ضروری ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ دوسروں پر جھوٹا الزام دینے کو اپنا طریق فکر بنائیں وہ یقینی طور پر حقیقت پسندی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا میں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں۔

اس قسم کی باتیں کرنے والے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ دو واقعات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ایسے لوگ جہاں بھی ہوں وہ ہمیشہ صرف فساد پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی ایک حکومت یا ان کا ایک بھائی اگر ۹۹ کام صحیح کرے اور اس سے ایک کمزوری ظاہر ہو جائے تو وہ اسی کمزوری کو لے کر ایسا ہنگامہ کریں گے گویا وہ اس کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

ایک سفر

۱۲ مئی ۱۹۸۴ کی صبح کو مجھے رانچی (بہار) جانے کے لئے انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۹ پکڑنی تھی۔ صبح کو فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوا۔ دہلی ایئرپورٹ پہنچا تو سورج کا روشن چہرہ افق سے اوپر آچکا تھا۔ ہوائی اڈہ کی روشنیاں اگرچہ ابھی بجھائی نہیں گئی تھیں مگر سورج کی روشنی کے آگے وہ اپنا وجود کھوتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بجلی کے وہ قمقمے جو ہوائی اڈہ کو رات کے وقت "دن" بنائے رہتے ہیں، جب سورج نکلا تو ایسا معلوم ہوا گویا ان میں کوئی روشنی ہی نہ تھی۔

سورج کے ظاہر ہوتے ہی تمام چمک دار بلب ماند پڑ گئے۔ فلڈ لائٹ کے کھمبے بے نور نظر آنے لگے۔ سورج نے اگرچہ لفظوں کی صورت میں کوئی اعلان نہیں کیا، مگر اس کا نکلنا ہی مصنوعی روشنیوں کے بے حقیقت ہونے کا اعلان بن گیا۔

اس دنیوی واقعہ میں تھوڑی دیر کے لئے مجھے آخرت کی تصویر نظر آنے لگی۔ میں نے سوچا کہ ایسا ہی معاملہ آخرت میں ہونے والا ہے جب کہ خدا اپنے جلال و کمال کے ساتھ انسانوں کے سامنے آجائے گا۔ انسانی تاریخ ایک لمبی تاریخ ہے جو دنیا سے لے کر آخرت تک چلی جارہی ہے۔ موجودہ دنیا گویا اس کا "رات" کا لمحہ ہے اور آخرت اس کا "دن" کا لمحہ۔ آج بہت سے انسان جھوٹی بڑائی کا مقام حاصل کئے ہوئے ہیں۔ بہت سے "بلب" بظاہر چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر انسانی تاریخ کے اگلے مرحلہ میں جب خدا اپنے روشن چہرہ کے ساتھ سامنے آئے گا تو تمام مصنوعی بلب اچانک اس طرح اپنی روشنی کھو دیں گے جیسے کہ وہ جھوٹے بلب تھے۔ ان کی چمک محض وقتی تاریکی سے فائدہ اٹھانے کا نام تھی نہ کہ کوئی حقیقی چمک۔

ہوائی جہاز جب فضا میں اڑ رہا ہو تو اکثر مسافر آپ کو خوش باشی کی چیزوں میں مشغول نظر آئیں گے مگر کسی باشعور انسان کے لئے یہ اپنے عجز کا غیر معمولی تجربہ ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کے اندر معمولی خرابی آدمی کو ایک لمحہ میں ہلاکت تک پہنچا سکتی ہے۔ چنانچہ دوران پرواز مجھے اپنے عجز اور بے بسی کا غیر معمولی احساس ہوا بے ساختہ میرا دل بھر آیا۔ اس وقت مجھے ایک صاحب کی بات یاد آئی جنھوں نے پچھلے دن مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے بارہ میں عام خیال یہ ہے کہ آپ کے اندر کبر ہے۔ یہ سوچ کر بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

"کیسا کبر اور کیسی انا" میری زبان سے نکلا۔ ایک انسان کے پاس ہے کیا جو وہ انانیت دکھائے۔

اور کبر میں مبتلا ہو۔ بخدا، اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ خلاف واقعہ بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں نے مصلحت کی زبان اختیار نہیں کی۔ جو چیز مجھے حق نظر آئی اس کو میں نے حق کہا اور جو چیز مجھے باطل دکھائی دی اس کو باطل کہا۔ خدایا تو گواہ رہ کہ میں اس قسم کے تمام الزامات سے بری ہوں۔ میں نے صرف تیری بڑائی کا اعلان کیا اور لوگوں نے اس کو میری بڑائی سمجھا۔ میں نے تیری ذات کمال کی حمد کی اور لوگوں نے اس کو میری خودستائی خیال کیا۔ میں نے صرف حق کی یکتائی پر زور دیا اور لوگوں نے اس کو میری انانیت قرار دیا۔

جہاز جب روانہ ہوا تو ایئر ہاسٹس نے اپنے اعلان میں حسب معمول یہ جملہ بھی کہا:

Captain Chowdhry is in command

میں نے سوچا کہ انسان بھی کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ یہ دراصل خدا ہے جو جہاز کی کمانڈ میں ہے۔ مگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں کمانڈ میں ہوں۔ ہوائی جہاز کا اڑنا اس سے بڑا واقعہ ہے کہ کوئی انسان اس کو ظہور میں لاسکے۔ وہ بے شمار کائناتی اسباب جو ایک "مصنوعی چڑیا" کے اڑنے کو ممکن بناتے ہیں ان کو ذہن میں رکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں سب کچھ خدا کر رہا ہے، انسان تو بس مفت کا کریڈٹ پا رہا ہے۔

جہاز جب مسافروں کو لے کر فضا میں اڑتا ہے تو یہ قدرت کا حیرت ناک معجزہ ہوتا ہے۔ انسان نے المونیم اور پلاسٹک اور اسٹیل اور پٹرول جیسی کچھ چیزوں کو جوڑ کر ایک ڈھانچہ بنایا اور اس کو حرکت دی تو وہ مسافروں کو لے کر فضا میں اڑنے لگا اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچا دیا۔

اس واقعہ میں بیشتر حصہ خدا کا ہے۔ انسان کا حصہ بہت تھوڑا ہے۔ تاہم انسان جب تک اپنی جانب کا تھوڑا حصہ نہایت صحت کے ساتھ ادا نہ کرے کوئی جہاز کبھی فضا میں نہیں اڑ سکتا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ اسلامی انقلاب کا بھی ہے۔ اسلامی انقلاب تمام تر خدا کی قدرت سے وجود میں آتا ہے۔ انسان کو اس میں بہت تھوڑا حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہوائی جہاز کی دنیا میں انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ اپنی جانب کا حصہ واقعی طور پر ادا کئے بغیر وہ جہاز کو فضا میں نہیں اڑا سکتا۔ مگر اسلام کے علمبرداروں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی جانب کا تھوڑا حصہ بھی ادا نہیں کرتے اور جھوٹا جھنڈا لہرا کر اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسلامی انقلاب کے ہیرو ہیں۔

۱۲ مارچ کو ۱۰ بجے میں رانچی پہنچا۔ یہاں میرا قیام ہوٹل سمراٹ میں تھا۔ لوگ بڑی تعداد میں

ملنے کے لئے آتے رہے۔ اوران سے دینی وملّی موضوعات پر گفتگو جاری رہی۔ ایک صاحب جومختلف جماعتوں اور نظریات کا مطالعہ اور تجربہ کرتے رہے ہیں، ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی آخری دریافت کیا ہے۔ انھوں نے لیظھرہ علی الدین کلہ کی آیت پڑھی اور کہا کہ میرے نزدیک یہی وہ آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اس دنیا میں کیا کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ اس آیت میں لیظھرہ کے فعل کا فاعل خدا ہے۔ پھر کیا آپ ایک خدائی واقعہ کو انسانی مشن قرار دینا چاہتے ہیں۔

رانچی کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے جس میں تقریباً دو لاکھ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کی معاشی حالت عام طور پر اچھی ہے تاہم تعلیم میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کا کوئی اخبار نہیں۔ آپس کے اختلافات کی بھی، حسب معمول، ان کے اندر کمی نہیں۔

رانچی ضلع میں اور دوسرے ملحق اضلاع میں قدیم قبائل بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جن کو آدی باسی کہتے ہیں۔ یہ لوگ کوئی خاص مذہب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی تعصب اور تکلف سے خالی ہوتی ہے۔ ان کے اندر کٹرپن نہیں پایا جاتا۔ ان کے اندر اسلام کی تبلیغ کے زبردست مواقع ہیں۔ مگر اس امکان کو ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ عیسائی مشنریاں ان میں بہت بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہیں۔ اور بہت سے آدی باسی خاندانوں کو انھوں نے عیسائی بنایا ہے۔ تاہم اس کے باوجود اسلامی تبلیغ کے امکانات بدستور موجود ہیں۔ کیوں کہ عیسائی ہونے سے ان کی سماجی پوزیشن نہیں بدلی۔ وہ عیسائیوں کے اندر اچھوت کی مانند رہتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی نئی نسل میں عیسائیت کے خلاف عدم اطمینان پایا جاتا ہے۔

انگریزی حکومت کے آخری دور میں عیسائی مشنریوں نے بہت بڑی تعداد میں یہاں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں اتنے بڑے بڑے عیسائی مشن قائم ہیں جن کا رقبہ کئی کئی میل کے دائرہ میں پھیلا ہوا ہے۔

مولانا قاضی شعیب احمد ایم اے (شعبۂ اردو رانچی یونی ورسٹی) نے اپنا ایک ذاتی واقعہ ان الفاظ میں بتایا:
میں رانچی کے قریب ایک گاؤں اٹکی میں تھا، اٹکی میں مشن کا بڑا علاقہ ہے۔ یہ عیسائی مشن تعلیم و تربیت کے علاوہ تبلیغ کا کام بھی کرتا ہے۔ وہاں کے پادری سے ہمارے تعلقات تھے، کئی مسلمان ان کے ملنے والے تھے، یہ بات غالباً ۱۹۶۵ کی ہے۔ میں نے ایک دن پادری صاحب سے سوال کیا کہ آپ طویل مدت سے اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام کرتے آرہے ہیں، غیر مسلموں میں آپ کی تبلیغ کے اثرات تو مجھے معلوم ہیں یہ بتائیے کہ اب تک کتنے مسلمان ہیں جنھیں آپ نے اس علاقہ میں عیسائی بنایا ہے۔ میرے اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا:

مولوی صاحب! میری یادداشت کے مطابق رجسٹرڈ لوگوں میں ایک بھی نام نہیں، پھر انھوں

نے اٹکی کے ٹُلی میاں جنھیں عرف عام میں بادشاہ نانا کہا جاتا تھا، کا واقعہ سنایا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ پادری صاحبان کی تبلیغ سے عیسائیت اختیار کرنے پر راضی ہو گئے مگر جب ان کے نام سے محمد کا لفظ نکال کر دوسرا نام رکھا گیا تو وہ بگڑ کر عیسائیت سے الگ ہو گئے اور اس کے بعد پہلے سے زیادہ متشدد مسلمان بن گئے۔

رانچی کے زمانہ قیام میں مولانا ابوالکلام آزاد کو اندازہ ہوا کہ اس علاقہ کے مسلمان عیسائی مشنریوں کی زد میں ہیں اور غیر معمولی تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے ہر طرح کی بربادی کا شکار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ۱۵ اگست ۱۹۱۷ کو انجمن اسلامیہ رانچی کی بنیاد ڈالی۔ اس کام میں انھیں مقامی طور پر غیر معمولی تعاون ملا۔ مولوی ضیاء الحق جو جامع مسجد میں موذن تھے انھوں نے ایک زمین مدرسہ کی عمارت کے لئے وقف کر دی جس کی قیمت اس وقت آٹھ ہزار روپے سے زیادہ تھی۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی اس کی امداد میں حصہ لیا۔ مثلاً رائے بہادر ریٹھاکر داس، منشی جگت پال سہائے وکیل وغیرہ۔ منشی ظہور علی رئیس ڈورنڈا نے خصوصی تعاون کیا۔ چنانچہ مذکورہ زمین پر مولانا آزاد نے خود اپنی نگرانی میں ایک بڑی عمارت تعمیر کرائی جو ابھی تک موجود ہے۔ مولانا آزاد نے البلاغ پریس کی پوری رقم بھی اس عمارت کی تعمیر میں دے دی تھی۔

مذکورہ مدرسہ ایک عرصہ تک آزاد تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۹۲۷ میں مالی پریشانیوں کی وجہ سے بہار مدرسہ اکزامی نیشن بورڈ سے اس کا الحاق کر دیا گیا۔ تاکہ حکومت کی مدد کے ذریعہ اسے باقی رکھا جا سکے۔ اب اس میں مولوی، عالم، فاضل کے امتحانات کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ اس وقت مدرسہ کے اسٹاف میں پندرہ اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ مدرسہ کے ان امتحانات کو حکومت نے آئی اے بی اے اور ایم اے کے برابر تسلیم کر لیا ہے۔ مدرسہ کے نئے منتظمین کا منصوبہ ہے کہ مولانا آزاد کی اس واحد یادگار کو مزید ترقی دے کر ایک بڑا ادارہ بنا دیا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے قیام رانچی کے زمانہ میں یہاں کی جامع مسجد میں پابندی سے تقریر کرتے تھے اور قرآن کا درس دیتے تھے۔ اپنی تفسیر ترجمان القرآن کا بھی بڑا حصہ انھوں نے رانچی ہی میں تحریر کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد تقریباً چار سال (۱۹۱۹-۱۹۱۶) رانچی میں نظر بند کی حیثیت سے رہے نظر بندی کی اس مختصر سی مدت میں انھوں نے یہاں کے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بہت سے دیرپا کام کئے۔ عربی مدرسہ، اسکول، اسپتال، قبرستان، رسوم کی اصلاح وغیرہ۔ یہ سب خالص تعمیری کام تھے۔ جن کے اثرات اب تک رانچی میں موجود ہیں ـــــ عجیب بات ہے کہ ہمارے بڑے بڑے قائدین

کو تعمیری کام کرنے کا خیال صرف اس وقت آیا جب کہ انھیں کام کے میدان سے ہٹا دیا گیا تھا۔

رانچی میں میرے حسب ذیل پروگرام تھے:

۱۲ مئی ۱۹۸۴ شام کو نماز مغرب کے بعد آر۔علی بلڈنگ میں " اسلامی دعوت " کے موضوع پر خطاب

۱۳ مئی " صبح ۹ بجے ہوٹل سمراٹ میں " مطالعہ قرآن کے اصول " کے موضوع پر ائمہ اور اساتذہ کے کے سامنے ایک گفتگو۔

۱۱ بجے شہر کے مسلم اسپتال اور تعلیمی اداروں کا معائنہ۔

۴ بجے شام مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور کارناموں پر سیمینار کی صدارت

شام کو نماز عشا کے بعد اجلاس عام کی صدارت اور تقریر

شام کے آخری اجلاس میں تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام کی کافی بڑی تعداد تھی۔ مختلف لوگوں کی تقریریں ہوئیں۔ آخر میں میں نے مفصل طور پر ایک تقریر کی جس کا موضوع تھا " ملت کی تعمیر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں"۔ پورا مجمع تقریر کے آخر تک نہایت سکون کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جلسہ کے بعد ایک صاحب نے کہا ـــــ " رانچی کی تاریخ میں یہ پہلا اجتماع تھا کہ لوگ آخر تک بیٹھے تقریر سنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اٹھنا ہی نہیں چاہتے۔

رانچی سے دہلی کے لئے واپسی ۱۴ مئی ۱۹۸۴ کو فلائٹ نمبر ۴۱۰ سے ہوئی۔ جہاز کے اندر انڈین ایرلائنز کا ماہنامہ سواگت (مئی ۱۹۸۴) پڑھنے کا اتفاق ہوا اس میں ایک مضمون (Behind the Scenes) کے عنوان سے تھا۔ اس میں کامن ویلتھ ہڈس آف گورنمنٹ میٹ CHOGM کے سفر کی روداد درج تھی جو نومبر ۱۹۸۳ میں نئی دہلی میں ہوئی تھی اور جس میں دولت مشترکہ کے سربراہان مملکت شریک ہوئے تھے۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۳ کو انڈین ایرلائنز کے چار خصوصی طیارے ان ۳۹ سربراہان کو دہلی سے گوا لے گئے جو دنیا کی آبادی کے ایک تہائی حصہ کے نمائندہ تھے۔ جیسے ہی گھڑی نے بارہ بجائے ایر لائن اپنی عظیم ذمہ داری (Great responsibility) کی ادائگی کے لئے متحرک ہوگئی۔ امپورٹڈ موٹروں کا قافلہ ٹھیک بارہ بج کر ۵ منٹ پر اہم ترین شخصیتوں (VVIP) کے ٹرمنل پر آکر کھڑا ہوگیا تاکہ اپنے ممتاز مسافروں کو ہوائی جہاز پر سوار کرائے۔ پورا عمل گھڑی کی سوئی کی سی صحت کے ساتھ بالکل متعین وقت پر انجام دیا گیا:

It was an operation that moved with clock work precision and smoothness, with exact "on time".

آدھ گھنٹہ کے اندر چاروں خصوصی جہاز گوا کے ہوائی اڈہ ڈابولم (Dabolin) پر اتر گئے۔

یہ پورا آپریشن نہایت صحت اور باقاعدگی کے ساتھ ہوا۔ اس کا راز تھا کئی مہینے کی محتاط منصوبہ بندی

(Careful planning) اس کے لئے ایک خصوصی چوگم سل بنایا گیا۔ ہر چھوٹی تفصیل پر پوری توجہ کی گئی تاکہ اس معاملے کی مکمل کامیابی کی ضمانت ہو سکے:

Attention was paid to each small detail to ensure the complete success of this challenging exercise.

یہ تیاریاں کئی محاذ پر جاری تھیں۔ انڈین ایر لائنز کے کارکنوں کی فوج سے انتہائی تربیت یافتہ اور تجربہ کار مردوں اور عورتوں کا انتخاب کیا گیا۔ جو جہاز ان ممتاز مسافروں کی سواری کے لئے استعمال کئے جاتے والے تھے ان کو دوبارہ درست کیا گیا اور ان میں ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ منتخب عملہ کی از سر نو تربیت کی گئی۔ ان جہازوں کو اڑانے کے لئے وہ سنیئر ہوا باز چنے گئے جن کا فلائنگ تجربہ ۲۵ ہزار گھنٹہ سے زیادہ تھا۔ بطور ریہرسل کے دہلی سے گوا اور گوا سے دہلی کے لئے دو پیشگی پروازیں کی گئیں تاکہ ہر چیز کا پہلے سے عملی اندازہ کیا جاسکے۔ ۲۷ نومبر کو ان معزز مہمانوں کو دہلی واپس آکر ڈنر کھانا تھا۔ چنانچہ نہایت صحت وقت کے ساتھ انھیں دوبارہ واپس دہلی پہنچا دیا گیا۔

مذکورہ بالا قسم کی مختلف تفصیلات بیان کرنے کے بعد آخر میں مضمون نگار نے اپنے مضمون کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا:

A test, you might say, the airline passed with flying colours.

یہ ایک آزمائش تھی جس میں انڈین ایر لائنز شاندار طور پر کامیاب ہوئی۔

یہ الفاظ میں انڈین ایر لائنز کے ایک ایسے جہاز میں پڑھ رہا تھا جو اپنے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ چوگم کانفرنس کے موقع پر اسی قسم کا اظہار دہلی کے محکمہ ٹیلیفون نے بھی کیا تھا۔ اس نے پر فخر طور پر کہا تھا کہ سربراہان مملکت کے لئے ٹیلیفون کا اتنا اعلیٰ انتظام تھا کہ ان میں سے کوئی شخص اگر کسی بیرونی ملک سے بات کرنا چاہتا تو صرف تین منٹ کے اندر اس کا رابطہ مطلوبہ ملک سے قائم ہو جاتا تھا۔ حالاں کہ دہلی کے کسی عام باشندہ کے لئے اتفاقاً ہی کبھی یہ خوش قسمتی پیش آ سکتی ہے کہ وہ صرف تین منٹ کے اندر ملک کے اندر یا ملک کے باہر ٹیلی فونی رابطہ قائم کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ چھوٹے پرچے حل کر کے امتحان پاس کرنا ہے۔ انڈین ایر لائنز (یا محکمہ ٹیلی فون) کی جانچ کا معیار اس کی روزمرہ کی کارکردگی میں ہے نہ کہ سربراہان مملکت کے لئے وقتی سہولتیں فراہم کرنے میں۔ وقتی حسن کارکردگی اسی وقت کوئی قیمت رکھتی ہے جب کہ وہ آدمی کی عام حسن کارکردگی بن جائے۔

تعمیر کے نام پر تخریب

۶۷ - ۱۹۶۶ کا زمانہ شمالی ہندستان کی مسلم سیاست میں بڑے جوش وخروش کا زمانہ تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس سیاست کے ہیرو تھے۔ ان پر اور ان کے ساتھیوں پر اچانک یہ راز منکشف ہوا کہ وہ اپوزیشن پارٹیوں کے انتخابی اتحاد میں شریک ہو کر حکمراں کانگرس کو اقتدار سے "ہٹا سکتے" ہیں اور اس طرح ملک میں اپنے لئے باعزت زندگی کا حق وصول کر سکتے ہیں۔ نان کانگریسزم کی اس منفی سیاست پر مولانا موصوف کو اتنا یقین تھا کہ انھوں نے اپنی شخصیت کا پورا وزن اس کے خانہ میں ڈال دیا۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> "گزشتہ دو ماہ میں ہم نے کیا حاصل کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کوئی کھوئی ہوئی امت اگر خود کو تلاش کرلے تو یہ کولمبس کے نئی دنیا کی "تلاش کرنے کے کارنامہ سے بھی زیادہ عظیم ہے (ندائے ملت ۱۳ مارچ ۱۹۶۷)

جھوٹے فخر کی یہ غذا مسلمانوں کی نفسیات کے نہایت حسب حال تھی۔ چنانچہ بھیڑ کی بھیڑ اس نعرہ پر ٹوٹ پڑی جس میں سمندروں کو عبور کرنے کی مصیبت اٹھائے بغیر کولمبس سے زیادہ بڑی دریافت صرف دو ماہ میں حاصل ہو رہی تھی۔

تاہم اس سطحی سیاست پر میرا دل بہت دکھی تھا۔ میں نے اسی زمانہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے خط وکتابت کی۔ میں نے لکھا کہ میں آپ سے مل کر گفتگو کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم کروں کہ آپ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے کہ —— "ہم نے اپنے آپ کو پا لیا ہے"۔ مگر مولانا موصوف نے ملاقات کا وقت نہیں دیا۔ انھوں نے لکھا کہ اس سلسلے میں ان کے قریبی رفقاء مولانا محمد منظور نعمانی اور ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے گفتگو کروں۔

۱۵ اپریل ۱۹۶۷ کو میں نے لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانی سے ملاقات کی۔ میں نے دلائل کی روشنی میں بتایا کہ آپ حضرات کی موجودہ سیاست سراسر لایعنی سیاست ہے۔ اس کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو ملنے والا نہیں۔ بلکہ تقریباً یقینی ہے کہ اس قسم کے اقدام کے بعد حالات اور زیادہ بگڑ جائیں۔ مگر کھلے کھلے دلائل کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور اپنے

سیاسی مسلک سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر میں کچہری روڈ (لکھنور) کی مسجد سے اس طرح اٹھا کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا اور میری زبان پر عربی کا یہ شعر تھا:

اذا کان الغراب رئیس قوم سیھدیھم الی دار البوار

اس کے بعد ۱۷ اپریل ۱۹۶۷ کو ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (۱۹۱۲ - ۱۹۷۴) سے ان کی لکھنؤ کی قیام گاہ (حضرت گنج) میں ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ مل کر بالفرض آپ کانگرس کو اقتدار سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے مسلمانوں کی قسمت ہرگز بدلنے والی نہیں۔ کیوں کہ اس کے بعد جس کو اقتدار ملے گا وہ آپ نہیں ہوں گے بلکہ کانگرس ہی کی طرح کے دوسرے لوگ ہوں گے۔ یہ گفتگو پون گھنٹہ تک جاری رہی۔ جب وہ میرے دلائل کا جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو انھوں نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی:

اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) میں چینج (تغیر) تو ہوگا

۱۹۶۷ کے الکشن کے نتیجہ میں اسٹیٹس کو میں چینج ہوا مگر اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کانگرسی عناصر کی جگہ جن سنگھی عناصر حکومت میں غالب آگئے۔ "نئی دنیا کی دریافت" نئی سیاسی خندق میں گرنے کے ہم معنی بن گئی۔ شاید نادانی کی یہی وہ قسم ہے جس کے بارہ میں انگریزی کہ یہ کہاوت بنی ہے کہ —— بیوقوف لوگ وہاں جاگھستے ہیں جہاں فرشتے قدم رکھنے سے گھبراتے ہیں:

Fools rush in where angels fear to tread

"اسٹیٹس کو میں چینج" کی اس منفی سیاست میں مسلمان پچھلے سو سال سے مبتلا ہیں۔ وہ پرشور سیاست چلا کر ایک برائی کو ہٹاتے ہیں اور اس کا نتیجہ طرف یہ ہوتا ہے کہ نئی شدید تر برائی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس قسم کی سیاست اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر باطل ہے۔ ایک فساد کو دوسرے فساد سے تبدیل کرنا شیطان کے کارندوں کا طریقہ ہے نہ کہ خدا کے پیغمبروں کا۔

پاکستان میں مخصوص اسباب کے تحت اس قسم کی تخریبی سیاست کے لئے خصوصی مواقع موجود تھے۔ چنانچہ پچھلے تقریباً ۴۰ سال سے یہ ملک اس قسم کی بے معنی سیاست کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ یہاں بار بار یہ واقعہ ہو رہا ہے کہ عہد ساز مفکرین اکھیڑ پچھاڑ کے ذریعہ ایک سیاسی تبدیلی لاتے ہیں، صرف اس لئے کہ بعد کو یہ اعلان کریں کہ نیا دور پچھلے دور سے بھی زیادہ برا ثابت ہوا ہے۔ مزید یہ کہ سطحیت کے اس دور نے لوگوں کو موقع دے دیا ہے کہ وہ عملاً مخرب اسلام کا کردار ادا کریں۔ اس کے باوجود اپنے معتقدین کے درمیان وہ معمار اسلام کے پرفخر لقب سے یاد کئے جاتے رہیں۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے کچھ ایسے "تغیر پسند عناصر" پالئے جن کے ساتھ مل کر وہ لیاقت علی خاں کی "غیر اسلامیت" کے خلاف ہنگامہ آرائی کر سکیں۔ یہ تحریک اس طرح ختم ہوئی کہ ۱۹۵۱ میں ایک شخص نے لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد پاکستان میں اکھیڑ پچھاڑ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۸ میں جنرل محمد ایوب خاں برسر اقتدار آ گئے۔

اب سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان پر منکشف ہوا کہ جنرل ایوب خاں کی حکومت پہلے سے بھی زیادہ بری ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ سماج میں ہمیشہ قائم شدہ نظام کے خلاف ناراضگی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کو دوبارہ کچھ تغیر پسند عناصر مل گئے اور انھوں نے جنرل محمد ایوب خاں کے خلاف ہنگامہ آرائی کی سیاست شروع کر دی یہ سیاست مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی آخر کار اس منزل تک پہنچی کہ گیارہ سالہ اقتدار کے بعد جنرل ایوب کو تخت سے ہٹ جانا پڑا۔ اس کے بعد الکشن ہوا جس کے نتیجہ میں ۱۹۷۱ میں ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں برسر اقتدار آ گئے۔

اب سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان پر دوبارہ اس سیاسی حقیقت کا انکشاف ہوا کہ بھٹو کا دور ایوب کے دور سے بھی زیادہ برا ہے۔ چنانچہ دوبارہ انھیں اپنے سیاسی جہاد کے لئے ساتھیوں کی تلاش ہوئی جو حسب معمول بہت جلد حاصل ہو گئے۔ مسٹر بھٹو کے خلاف یہ مہم بالآخر اس شکل میں کامیاب ہوئی کہ ۱۹۷۷ میں پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق کا اقتدار اقتدار قائم ہو گیا۔ اور بھٹو کو پھانسی دے دی گئی

سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان نے ابتداءً اپنے سیاسی مقاصد کے تحت جنرل ضیاء الحق کا مکمل ساتھ دیا۔ مگر تازہ ترین خبروں کے مطابق ان علم برداران انقلاب پر دوبارہ یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ جنرل ضیاء کا دور حکومت بھٹو کے دور حکومت سے بھی زیادہ برا ہے۔

پاکستان کی جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اس سلسلے میں مفصل قراردادیں پاس کی ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان سے متعلق اس کی قرارداد کا ایک حصہ حسب ذیل ہے:

" (جنرل محمد ضیاء الحق کی) حکومت اور اس کی انتظامیہ نے تعلیمی اداروں کے سکون کو جس بے تدبیری اور بے دردی سے تہ و بالا کر دیا ہے اس نے پوری قوم کے ہر خیر خواہ کو سخت

حیرت زدہ کر دیا ہے۔ یونینوں کے انتخاب بخیر وخوبی انجام پائے ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بغیر کسی وجہ جواز یونینوں اور طلبہ تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی اور اس اقدام کے خلاف تعلیمی اداروں کے اندر بھی احتجاج کے سارے دروازے طلبہ پر بند کر دئے گئے۔ اس کے بعد ظلم وزیادتی کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے جس نے بھٹو اور کھر کے دور کو بھی مات کر دیا ہے۔ طلبہ کے منتخب نمائندوں کو کالج اور ہوسٹلوں سے اخراج پر طلبہ کا احتجاج بالکل فطری امر تھا۔ اس پر سولہ سترہ سال کے لڑکوں کو ننگا کرکے پیٹا گیا ہے۔ ان کو لاٹھیوں اور دوسرے اسلحہ سے زدوکوب ہی نہیں کیا گیا ہے، ان کے ہاتھوں سے ناخن نوچے گئے اور ان کے جسم کے نازک حصوں کو جلتی موم بتیوں اور سگریٹ لائٹرز سے جلایا گیا ہے۔ ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر کئی کئی دن اس طرح رکھا گیا ہے کہ وہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے۔ ان کو نماز تک پڑھنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اور نماز کی درخواست پر ان کی پٹائی کے علاوہ نہایت غلیظ گالیوں کی بوچھار کی گئی۔ صرف طلبہ ہی نہیں، ان کے بہن بھائی اور بوڑھے والدین تک کو گرفتار کر کے تھانوں میں محبوس رکھا گیا۔ اور ان کے باپوں ہی کو نہیں ماؤں کو بھی زدوکوب کیا اور غلیظ گالیوں سے نوازا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کوڑوں کی سزائیں دی گئی ہیں اور حکومت کے ذمہ دار ترین افراد کو توجہ دلانے اور ان حقائق سے آگاہ ہونے کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ حکومت ظلم وستم کے ہر حربے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور اپنے پیش رو جابر وظالم حکمرانوں کے انجام سے کوئی سبق سیکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔۔۔۔ اقتدار سے بڑھ کر ناپائدار کوئی شے نہیں ہے۔ یہ کرسی جس پر صدر (ضیاء الحق) صاحب کو اس قدر بھروسہ ہے، ان کے پیشرو کو بھی آخری لمحہ تک انتہائی مضبوط نظر آتی تھی۔ اس لئے ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ وہ کرسی پر تکیہ کرنے کے بجائے عدل وانصاف کا راستہ اختیار کریں۔" (زندگی، جون ۱۹۸۴)

مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن میں بھٹو پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور مخالف پارٹیوں کے ساتھ مل کر بھٹو حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کیا جو توڑ پھوڑ تک جا پہنچا۔ ان حالات نے فوجی افسروں کو موقع دے دیا۔ اور وہ بھٹو کو گرفتار کرکے جولائی ۱۹۷۷ میں حکومت پر قابض ہوگئے۔ اب اگر مذکورہ قرارداد کے مطابق پاکستان کی فوجی حکومت ظالم ہے تو اس سے بڑے ظالم وہ لوگ ہیں جن کی جھوٹی سیاست نے اس ظالم حکومت کو برسر اقتدار آنے کا موقع دیا۔

جماعت اسلامی ہند کے سرکاری ترجمان ماہنامہ زندگی (جون ۱۹۸۴) نے جماعت اسلامی

پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مذکورہ قرارداد اپنے صفحات میں نقل کی ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں یہ الفاظ درج ہیں:

" یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ وہ امت مسلمہ کو ان سربراہوں، لیڈروں اور حکمرانوں سے کب نجات بخشے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہیں"

ماہنامہ زندگی نے اس صورت حال کی ذمہ داری نہایت معصومانہ انداز میں " حکمرانوں " پر ڈالی ہے۔ حالاں کہ اس کی ذمہ داری خود سید ابو الاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ لوگ " اسٹیٹس کو میں چینج "، کو کام سمجھتے رہے۔ حالاں کہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ فساد اور تخریب کے سوا اور کچھ نہ تھا حقیقت یہ ہے کہ زیادہ قرین انصاف بات یہ تھی کہ ماہنامہ زندگی لکھتا کہ " یہ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ وہ امت مسلمہ کو جھوٹے اسلامی رہنماؤں سے کب نجات بخشے گا " اس کے برعکس اس نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دی۔

افسوس کہ لوگوں میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ سیدھی طرح اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں۔ وہ اپنی کھلی کھلی حماقتوں کا الزام بھی دوسروں کے سر پر ڈالنا چاہتے ہیں، صرف اس لئے کہ ان کا فخر ان سے نہ چھنے۔ اپنے جس قائد کو انھوں نے بطور خود عہد ساز مفکر کا لقب دے رکھا ہے وہ بدستور اپنی جگہ پر باقی رہے۔

آپ کانٹے دار درخت کو پھل دار درخت بتاکر اس کا بیج بوئیں اور جب اس سے کانٹوں کا درخت ظاہر ہو تو اس کی ساری ذمہ داری زمین پر ڈال دیں۔ تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اپنی نا اہلی کا الزام خدا کو دینا ہے۔ اگرچہ یہ بے حد سخت بات ہے مگر اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں ہمارے لیڈر ساری دنیا میں یہی کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر ایک ہنگامہ اٹھاتے ہیں اور جب قانون قدرت کے تحت ان کی ہنگامہ آرائیوں کا الٹا نتیجہ سامنے آتا ہے تو فوراً اس کی تمام ذمہ داری دوسروں کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کہہ کر وہ خدا کی سچائی کو مشتبہ کرنا چاہتے ہیں نہ کہ کسی انسان کی سچائی کو۔ کیوں کہ جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ براہ راست قدرت کے قانون کی بنا پر برآمد ہوا ہے نہ کہ حقیقتہً کسی انسان کی بنا پر۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں خود اپنی مرضی کی دنیا بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ٹھنٹھ کو شاداب درخت کا نام دے رہے ہیں۔ وہ اپنے بے نور دئے پر روشن چراغ کا لیبل لگا کر خوش ہیں۔ وہ اپنی جھوٹی بڑائی کو ہر حال میں باقی رکھنا چاہتے ہیں خواہ اس کی وجہ سے خدا کی بڑائی مجروح ہو جائے۔

انگریزی الرسالہ

الرسالہ کا انگریزی اڈیشن پابندی سے ہر ماہ نکل رہا ہے۔ زبان و بیان ہر لحاظ سے بفضلہ تعالیٰ وہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ ایک امریکی نومسلم جو انگریزی الرسالہ شروع سے پڑھ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ الرسالہ مجھ کو بہت پسند ہے۔ وہ مسلم دنیا کا واحد انگریزی رسالہ ہے جو خالص دعوتی اور تعمیری انداز میں نکلتا ہے۔ میں الرسالہ کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

الرسالہ خالص دعوتی مقصد سے نکالا گیا ہے اور دعوت پوری امت کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اس اعتبار سے الرسالہ (انگریزی) کسی خاص ادارہ کا پرچہ نہیں وہ پوری امت کا پرچہ ہے۔ اس کا تعاون کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کے سلسلے میں آپ اپنی ذمہ داری کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ:

اس کے خریدار بنائیں اور ایجنسی قائم کریں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔
اس کے لئے مالی تعاون کریں تاکہ اس کا خسارہ پورا کیا جاسکے۔

نوٹ: انگریزی الرسالہ کی خریداری اور ایجنسی کے شرائط وہی ہیں جو اردو الرسالہ کے ہیں۔

—— ادارہ الرسالہ

علاقائی زبانوں میں کتابیں

سچا راستہ (تلگو)	Rs. 3.50
دینی تعلیم (تلگو)	Rs. 4.50

پتہ: اسلامک سنٹر، 3-6-373/A حمایت نگر۔ حیدرآباد 29

منزل کی طرف (مرہٹی)	Rs. 3.50

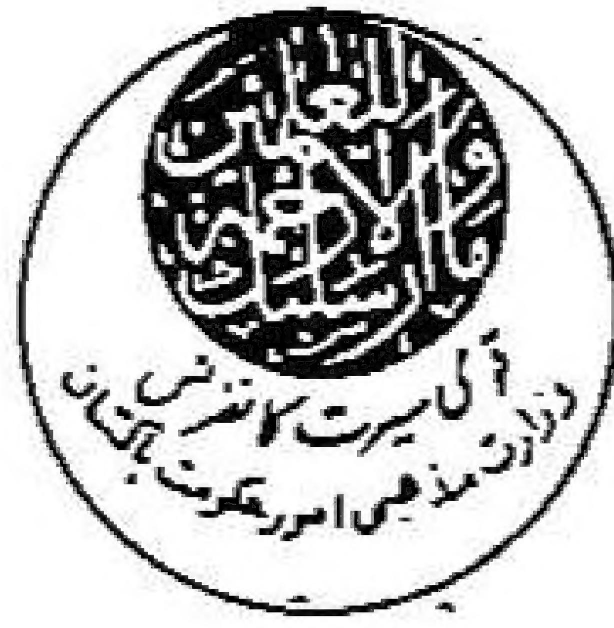
پتہ: فٹ ویل سیٹ سنٹر 1050 رویوار پیٹھ پونہ 2

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکومتِ پاکستان

وزارتِ امورِ مذہبیہ

اسلام آباد



تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۴ھ
۱۸ دسمبر ۱۹۸۳ء

نمبر ۱(۱) وڈس/آر آر/83

سندِ امتیاز

نہایت مسرت سے تصدیق کی جاتی ہے کہ جناب **مولانا وحید الدین خان صاحب** کی تالیف کردہ کتاب **پیغمبرِ انقلاب** بزبان **اردو** کتب سیرت النبی ؐ کے قومی مقابلہ برائے سال **۱۴۰۲-۳ھ** میں اوّل انعام کی مستحق قرار پائی اور مؤلف موصوف کو مبلغ **دس** ہزار روپے حکومتِ پاکستان کی طرف سے بطورِ انعام دیئے گئے۔

برہان احمد فاروقی

سیکریٹری

وزارتِ امورِ مذہبیہ حکومتِ پاکستان

اسلام آباد

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱. اسلامی لکچر پروگرام کے تحت ۱۱ اپریل ۱۹۸۴ کو اسلامی مرکز کے ہال میں ایک اجتماع ہوا جس میں شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات شریک ہوئے۔ مثلاً جناب حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد دواخانہ) پروفیسر مشیر الحق صاحب (جامعہ ملیہ اسلامیہ) مولانا احمد علی صاحب (آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت) وغیرہ۔ تلاوت قرآن کے بعد مولانا محسن عثمانی ندوی نے اسلامی مرکز کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (لاہور) نے اسلام کے موضوع پر مفصل تقریر کی۔

۲. اسلامی مرکز میں ہر مہینہ کے آخری اتوار کی شام کو بعد نماز مغرب مولانا وحید الدین خاں (صدر اسلامی مرکز) کا درس قرآن ہوتا ہے۔ جولائی ۱۹۸۴ کے آخری اتوار (۲۹ جولائی) کو ایک پروگرام کے تحت مولانا موصوف کو کوالالمپور (ملیشیا) میں رہنا تھا۔ چنانچہ مولانا نے پیشگی طور پر ۴۵ منٹ کا ایک درس قرآن ٹیپ پر ریکارڈ کرا دیا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۸۴ کو مولانا کی غیر موجودگی میں اجتماع ہوا اس میں یہی ٹیپ حاضرین کو سنایا گیا۔ لوگوں نے اس طریقہ کو بہت پسند کیا اور خواہش ظاہر کی کہ آئندہ بھی مولانا کے بیرونی اسفار کے موقع پر اسی طرح ٹیپ پر درس قرآن محفوظ کر لیا جائے اور اسی کو اجتماع میں سنایا جائے۔

۳. پاکستان میں سرکاری سطح پر ایک عالمی مقابلہ سیرت ہوا تھا۔ اس مقابلہ میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتاب (پیغمبر انقلاب) کو اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ۲۷ اگست ۱۹۸۴ کو سفارت خانہ پاکستان (نئی دہلی) میں ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ اس موقع پر سفیر پاکستان جناب ہمایوں خاں صاحب نے مولانا موصوف کو حکومت پاکستان کی طرف سے "سند امتیاز" عطا کی جس کا عکس مقابل کے صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔ اس تقریب میں سفارت خانہ کے تمام ڈپلومیٹ اور اعلیٰ عہدیدار شریک تھے۔ سفیر پاکستان جناب ہمایوں خاں صاحب نے بعض عرب مہمانوں کی رعایت سے انگریزی میں تقریر کی جس میں مولانا موصوف کی علمی اور دینی خدمات کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد مولانا وحید الدین خاں صاحب نے مختصر تقریر کی جس میں کتاب "پیغمبر انقلاب" کا خلاصہ بیان کیا اور موجودہ زمانہ میں سیرت کے مطالعہ کی اہمیت واضح کی۔

۴. اسلامی مرکز سے شائع ہونے والی تفسیر "تذکیر القرآن" میں اس وقت سورہ کہف کا حصہ زیر ترتیب ہے۔ سورہ بنی اسرائیل (نصف قرآن) تک مکمل ہو کر کتابت بھی انجام پا چکی ہے۔ ان شاء اللہ عنقریب اس کا دوسرا حصہ شائع کیا جائے گا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور ہر ماہ صاحب ایجنسی اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مستول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. D(SE) No. 243
Regd. R.N. No. 28822/76

October, 1984
Issue No. 95

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128